چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی
بطور معاشرتی ناول نگار — تقابلی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فِل اردو

:: مقالہ نگار ::

سارہ عنبر

رول نمبر: 10

طالبہ شعبہ اردو

:: نگران ::

پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد

رئیس، کلیہ علوم اسلامی و لسانیات

سیشن 2001-2003

اس مقالے کی اجازت ایڈوانسڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ بورڈ کے اجلاس منعقدہ 9 جون/2002 میں آئٹم نمبر 21 کے تحت دی گئی

بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

بسم الله الرحمن الرحيم

تصدیق نامہ بسلسلہ تکمیلِ مقالہ ایم فل اُردو

اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ ایم۔فل، اُردو کی طالبہ عزیزہ سارہ عنبر کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی بطور معاشرتی ناول نگار ___ تقابلی مطالعہ'' کے مکمل مسودے کا مطالعہ بطور نگران دقتِ نظر سے کیا ہے۔ میں طالبہ کے تحقیقی و تنقیدی کام کے معیار سے مطمئن ہوں اور اس امر کی سفارش کرتا اور اجازت دیتا ہوں کہ اس مقالے کو ایم۔فل، اُردو ڈگری کی جانچ کے لیے جمع کروا دیا جائے۔

دستخط نگرانِ مقالہ: ____________________

اِنتساب!

والدِ محترم عبدالباسط

اور

والدۂ محترمہ شہر بانو کے نام

جن کی رہنمائی میرے لیے مشعلِ راہ بن کر

مجھے منزلِ مقصود تک پہنچانے کا سبب بنی۔

فہرست ابواب

صفحہ نمبر

دیباچہ

ادب میں تقابلی مطالعہ (Comparative Study) کی اہمیت سے چنداں انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی نقاد انفرادی ادیب کے ادب پر تنقید کرتے رہتے ہیں کسی ایک زبان اور ایک ثقافت کے نمائندہ ادیب کا تنقیدی جائزہ ادب کی دنیا میں کوئی نئی بات نہیں، اس کے برعکس دو مختلف زبانوں، صدیوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے فن کا ایک دوسرے کے ساتھ تقابلی جائزہ بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تقابلی مطالعہ ادب کی وہ شاخ ہے جو ادب کا آفاقی سطح پر تجزیہ کرتا ہے اور ادبی افق کو قاری کے ذہن میں مزید نمایاں کرتا ہے۔ تقابلی مطالعہ سے ادیبوں کے فن کے ایسے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو ایک منجھے ہوئے ادبی نقاد کا انفرادی ادیبوں کے فن کا مکمل تجزیہ کرنے سے سامنے نہیں لائے جاسکتے۔

موجودہ مقالہ چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے فن کا بطور ''معاشرتی ناول نگار'' تجزیہ کرتا ہے۔ شوکت صدیقی کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرتی اور معاشی ناانصافیوں کی تصویرکشی عہدِ وکٹوریہ (1837-1901) کے انگریزی ناول نگار چارلس ڈکنز کے سٹائل میں کرتے ہیں۔ موجودہ مقالے میں دونوں ادیبوں میں پائی جانے والی مماثلت اور امتیازات کو اس طرح سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ قاری دونوں ادیبوں میں موجود ایک ایسے واضح فرق کو محسوس کر سکتا ہے۔ جسے پہلے کسی اردو کے نقاد نے محسوس نہیں کیا ہے۔ یعنی ڈکنز معاشرتی ناانصافیوں کی تصویرکشی انتہائی رجائی اندازِ فکر کے ساتھ کرتا ہے جبکہ صدیقی کے ہاں یاسیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

آزادی کے بعد ناول لکھنے والوں میں شوکت صدیقی کا بلند ترین مقام ہے۔ میں نے ان کے اکثر ناول کچھ عرصہ پہلے پڑھ لیے تھے۔ ادب کے ذوق میں چارلس ڈکنز کو بھی میں نے پڑھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ دونوں ناول نگار معاشی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ میرا مطالعہ جتنا بڑھتا گیا اتنا زیادہ مجھے محسوس ہوا کہ متذکرہ مصنفین ایک ہی موضوع کے دو رنگ پیش کرتے ہیں اور پھر اچانک خیال آیا کہ ان کا تقابلی مطالعہ کیوں نہ کیا جائے! اسی خیال میں آگے بڑھنے کے عمل کو تحریک ملی۔ اُستادِ محترم ڈاکٹر انوار احمد

صاحب سے میں نے زیرِ تذکرہ موضوع کے متعلق ان کی رائے لی تو انہوں نے اپنے ادبی رجحانات کے پیشِ نظر ان دونوں مصنفین کے تقابلی مطالعہ کے حق میں رائے دی۔

اس مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں مجھے بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے ان مصائب کو مختلف اشخاص کی مدد سے حل کیا۔

میرے نگران، استادِ محترم ڈاکٹر انوار احمد صاحب نے میری قدم قدم پر رہنمائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اگر مجھے ان کی اصلاحی تنقید میسر نہ ہوتی تو شاید میں یہ مقالہ کبھی بھی مکمل نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ آج میں جس مقام پر ہوں وہ سب میرے استادِ محترم ڈاکٹر انوار احمد کی محبتوں اور شفقتوں کا ثمر ہے۔

میں اپنے اساتذہ کرام، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر عبدالروٴف شیخ، ڈاکٹر عامدار حسین بخاری، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر عقیلہ جاوید، ڈاکٹر ممتاز کلیانی، سر ساجد خان اور اپنی پیاری دوست شازیہ عنبرین کی تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے کام کے سلسلے میں میرا حوصلہ بڑھایا۔ اور تحقیقی کام کے مختلف مراحل میں میری مدد کی۔

میں جناب شوکت صدیقی صاحب کی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ اگر وہ مجھے میرے مقالے سے متعلق مواد فراہم نہ کرتے تو شاید اس مقالے کی تکمیل ناممکن ہو جاتی۔

میں اپنے والدِ محترم، بھائی عبدالبصیر اور تنویر احمد کی محبتوں اور اپنے مقالے کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کا قرض کبھی ادا نہیں کر سکتی۔ مقالے کی تکمیل کے دوران مجھے میرے چھوٹے

بہن بھائیوں عمارہ سنبل، فارحہ زعفران اور حسیب حسن کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ اور میں نے انتہائی پر سکون ماحول میں اپنا کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میں اپنی والدہ محترمہ کا کیسے شکریہ ادا کروں کہ جنہوں نے میرے لیے شبانہ روز دعائیں کیں۔ میری دلی دعا ہے کہ خدا ان کا سایہ ہم پر تا دیر قائم رکھے۔

میں جناب غلام محمد جھنڈیر صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میرے لیے اپنی لائبریری کے در وا کر دیئے۔

میں شعبہ اردو اور شعبہ انگریزی کے لائبریریز کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے مجھے میرے موضوع سے متعلق ہر کتاب فراہم کی۔ میں جناب ایاز محمود صاحب کی ممنون ہوں کہ انہوں نے یہ مقالہ مجھے وقت پر کمپوز کر کے دیا۔

میں اپنی دوستوں انجم کلثوم، ناظمہ آفتاب، صائمہ ارم، روبینہ الماس، زرغونہ کنول، فرحت افزا، ترنم بتول، ارم اجمل، میمونہ ناز اور فرزانہ پروین کی تہہ دل سے مشکور ہوں جن کی چاہت میرے شامل حال رہی۔

آخر میں مَیں اس ذاتِ پاک کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے مجھے میرا کام مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

ے میری ہست و بود کا ذکر کیا کہ کرشمہ تیری نظر کا ہے
جو پڑی نظر تو میں جی اُٹھا جو ہٹی نظر تو میں مر گیا

سارہ عنبر

باب اوّل

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے سوانحی آثار

مطابقت و امتیازات

باب اوّل

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے سوانحی آثار

مطابقت و امتیازات

ادبی تنقید میں تقابلی مطالعہ (Comparative Study) نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ تقابلی مطالعہ کی بدولت دو ادیبوں کے کام میں امتیاز کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تقابلی مطالعہ سے اُن پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو کسی بھی ادیب کے انفرادی کام پر تنقید کرنے سے نہیں پڑسکتی۔ اس سے ادبی تحقیق کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ دو ادیبوں کے تقابلی مطالعہ سے اُن کے ادبی مقام کا تعین سہل ہو جاتا ہے۔ ایک ہی زبان کے دو ادیبوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا رہا ہے لیکن دو مختلف علاقوں، زبانوں اور عہد کے ادیبوں کا تقابلی مطالعہ شاذ و نادر ہی منظرِ عام پر آیا ہے۔ دو مختلف زبانوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے درمیان تقابل کرنے میں بے انتہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ کسی ایک زبان کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ اصل متن کے مفہوم کو واضح نہیں کرسکتا۔ وہ ادیب جس کی تخلیقات کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جارہا ہو اُس ادیب کے اصل متن کو ترجمہ کے ساتھ دینا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے تاکہ قاری اصل متن کے وسیلے سے ترجمے کو سمجھ سکے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دو مختلف زبانوں، تہذیبوں اور عہد سے تعلق رکھنے والے ادیب ہیں۔ ان دونوں کے عہد میں تقریباً ایک صدی کا فرق ہے۔ دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے درمیان معاشرتی، ثقافتی اور ادبی فرق کا اندازہ تقابلی مطالعہ کی بدولت آسان ہو جاتا ہے۔ اس مقالہ میں بطور معاشرتی ناولِ نگار، چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کی تخلیقات میں تقابل اور فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی۔ کسی ادیب کے حالاتِ زندگی اُس کے ادب کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں ادیبوں کے حالاتِ زندگی سے واقفیت انتہائی ضروری ہے۔

چارلس ڈکنز 7 فروری 1812ء کو Portsmouth کے نزدیکی علاقہ Portsea میں پیدا ہوا (1)۔ اس کا باپ John Dicken بحری Pay Office میں کلرک تھا (2)۔ یہ خاندان نچلے اوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ John نوکروں کے خاندان میں سے تھا اور الزبتھ معمولی Bureaucrates میں سے تھی۔ ڈکنز کا والد زندہ دل اور فراخ دل تھا۔ لیکن اپنے ذرائع سے زیادہ خرچ کرنے کا رجحان تھا۔ اس کی ماں الزبتھ محبت کرنے والی تھی لیکن عملی معاملات کو نمٹانے میں نااہل تھی۔ یہ خاندان اقتصادی طور پر غیر مستحکم صورتحال کا شکار تھا۔ تنگدستی کو مٹانے کے لئے John Dickens نے قرضے لیے اور اپنا نجی پتہ تبدیل کر لیا۔ جب ڈکنز تین سال کا ہوا تو 1817ء میں اُس کے خاندان نے Chatham میں سکونت اختیار کر لی (3)۔ اس کے باپ کو Dockyard بنا دیا گیا۔ کچھ سال بہتر گزرے۔ اِس عرصے میں ڈکنز کی ماں نے اسے پڑھنا سکھایا۔ ساتھ ہی ڈکنز نے اُن کتابوں کو بھی بڑی تیزی سے پڑھ لیا جو ڈکنز کے والد نے جمع کر رکھی تھیں۔ جن میں شیکسپیئر، سروینٹز، سمالٹ، فیلڈنگ، ڈیفو اور گولڈسمتھ شامل تھے (4)۔ اِن کتب کے مطالعہ نے ڈکنز کے تصور کو وسیع کیا۔ اس وقت کے بہت سے مناظر ہم اُس کے خودنوشت مسودوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کے اس حصے کی عکاسی (جو انہوں نے Chatham میں گزارا) اس نے اپنے ناول "David Copperfield" (1849-50ء) میں کی ہے (5)۔

1822ء میں ڈکنز کا خاندان دوبارہ لندن آ گیا۔ ابھی ڈکنز دس سال کا تھا کہ اس کا باپ مقروض ہو کر قید کر لیا گیا۔ آٹھ بہن بھائیوں میں ڈکنز دوسرے نمبر پر تھا۔

''اس خاندان کی لندن میں واپسی ہوئی تو ان پر اقتصادی
مصیبت ٹوٹ پڑی۔ Chatham میں یقیناً وقت شاندار گزرا ہوگا۔
اِن کا خاندان Camden Town کے میلے کچیلے نواح میں آ گیا اور
ڈکنز کو سکول سے اُٹھا دیا گیا۔ اُسے گھریلو گھٹیا کاموں پر لگا دیا گیا۔
خاندان کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے اُسے Blacking

Factory میں گنوار ساتھیوں کے ساتھ کام کرنا پڑا''(6)۔

ڈکنز اُس کارخانے میں صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک کام کرتا تھا۔ ڈکنز کے نزدیک یہ دور اُس کی زندگی کا تاریک ترین دور تھا۔ جبکہ ڈکنز کو بچپن ہی سے پڑھنے کا بہت شوق تھا جس کا اظہار اس نے اپنے ناول "David Copperfield" میں کچھ یوں کیا ہے۔

''میرے باپ نے اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں کچھ کتابیں رکھی تھیں جن تک میری رسائی ہوگئی کیونکہ یہ کمرہ میرے کمرے سے ملحق تھا۔ میرے گھر کا کوئی اور فرد اس کمرے میں آنے کی زحمت گوارا نہ کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے بابرکت کمرے سے

Roderick Random, Peregrine Pickle, Humphrey Clinker, Tom Jones the Vicar of Wakefield, Don Quixote, Gil Blas, Robison Crusoe

برآمد ہوئیں۔ ان کتابوں نے میرے تصور کو زندہ رکھا اور میری موجودہ حیثیت سے بڑھ کر میری روشن امیدوں کو قائم رکھا۔ Arabian Nights اور Tales of the Genii بھی ان کتابوں میں شامل تھیں۔ ان کتابوں نے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ کیونکہ اگر اِن میں کوئی نقصان تھا تو وہ میرے لیے نہ تھا۔ یہ بات میرے لیے حیران کن ہے کہ ان سخت اور گھمبیر موضوعات پر توجہ دینے اور بھٹکنے کے درمیان مجھے ان کتب کو پڑھنے کا وقت کیسے مل جاتا تھا۔ یہ میرے لیے عجیب بات ہے کہ میں اپنے آپ کو ان چھوٹی تکالیف میں رہ کر کیسے تسلی دیتا تھا جو مجھے بڑی محسوس ہوتی تھیں۔ میں اپنے پسندیدہ کرداروں کے اندر اپنی شخصیت کا عکس دیکھتا تھا...... میں ہفتہ بھر کے لیے Tom Jones بن جاتا (ایک بچہ جو Tom Jones بن سکتا ہے) میں نے اپنے آپ کو مہینے

بھر کے لیے Roderick Random تصور کیے رکھا۔ میں واقعی
یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مہمات سے متعلق کتابوں اور سفر
ناموں کو پڑھنے کی بڑی آرزو تھی۔ میں اب بھول رہا ہوں۔ جو کچھ ان
الماریوں میں تھا۔ میں مکان کے اس حصے میں کئی دنوں تک جاتا رہا۔ میں
کبھی Royal British Navy کے کسی تصوراتی Captain کا
خیال کرتا جو وحشیوں کے نرغے میں گھر کر خطرے میں ہو۔ اور اپنی زندگی
کو داؤ پر لگا کر ان کا سامنا کرے...... میں اِس کے بارے میں سوچتا ہوں
تو گرمیوں کی ایک شام کی تصویر میرے ذہن میں اُبھرتی ہے کہ بچے
قبرستان میں کھیل رہے ہیں اور میں اپنے بستر پر ایسے پڑھ رہا ہوں جیسے
عمر بھر پڑھتا رہوں گا۔ ہمسائیگی میں گندم کا ہر گودام، چرچ کا ہر پتھر اور
قبرستان کا ہر فٹ (لمبائی کا یونٹ) ان تمام چیزوں کا میرے ذہن کے
ساتھ ایک خاص تعلق تھا جو ان کتب کے ساتھ منسلک تھا اور میں انہیں
اپنے علاقے سے منسوب کر لیتا تھا۔ میں نے Tom Pipes کو چرچ
کے کلس پر تصور میں چلتے ہوئے دیکھا میں نے Strap کو دیکھا جس کی
پیٹھ پر تھیلا ہے اور وہ گیٹ کے سامنے رُک گیا ہے۔ میں نے تصور میں
دیکھا کہ Commodore Trunian اپنا ڈنڈا تھامے ہوئے
Mr.Pickle کے ہمراہ ہمارے چھوٹے دیہاتی شراب خانے میں
موجود ہے (7)۔''

(P-58-59)

ناول ''David Copperfield'' کے پردے میں اس تخیلاتی ذہن کا مالک ڈکنز تھا۔ جو بچپن میں ہی کہانیاں پڑھنے کے بعد ان کہانیوں میں موجود کرداروں کو اپنی زندگی سے منسلک کر کے دیکھتا تھا۔ ڈکنز کو تخیلات کی اس دنیا میں محو دیکھ کر اس کے ایک رشتہ دار James Lament نے اُسے ایک کارخانے میں کام کرنے کی تجویز

دی اس بات کا ثبوت John Forster کی کتاب "The Life of Charles Dickens" سے ملتا ہے۔
اس کتاب میں John Forster نے چارلس ڈکنز کے خودنوشت مسودوں کے کچھ ٹکڑے اکٹھے کئے ہیں۔

''میرا رشتہ دار James Lament جو Bayham Street میں ہمارے ساتھ رہ چکا تھا اُس نے مجھے ان معمولات میں مصروف پایا اور یہ جانتے ہوئے کہ ہمارے گھریلو حالات بہتر نہیں ہیں تجویز دی کہ مجھے کارخانے (Warehouse) میں کام کرنا چاہئے۔ یہاں چھ شلنگ ایک ہفتے کا معاوضہ تھا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد نہیں ہے کہ یہ چھ تھے یا سات تھے۔ بہر حال اِس پیشکش کو میرے والدین نے بخوشی قبول کر لیا۔ اور ایک پیر کی صبح میں کارخانے میں چلا گیا تاکہ کاروبارِ زندگی شروع کر سکوں۔

یہ بات میرے لئے حیران کُن ہے کہ کتنی آسانی سے اس چھوٹی سی عمر میں مجھے اس کارخانے پر کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ یہ بات عجیب ہے کہ جب سے ہم لندن آئے۔ تب سے میں اس مشقت میں پڑ گیا اور اتنی نادر صلاحیتوں کے حامل بچے پر کسی کو رحم نہ آیا۔ زیرک، آرزؤں سے لبریز اور نفیس بچہ جو جلد ہی جسمانی یا ذہنی طور پر چوٹ کھا جائے۔ کسی نے بھی یہ تجویز نہ دی کہ تھوڑی سی رقم مختص کر کے اسے معمولی سکول میں پڑھایا جائے جو کہ یقیناً کی جا سکتی تھی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے بہی خواہ ہم سے تھک چکے تھے (8)۔''

چارلس ڈکنز کے باپ کی رہائی کے بعد ان کی نجی زندگی میں کچھ تبدیلی آئی۔ اُس کے باپ نے تجویز دی کہ ڈکنز کو سکول بھیجا جائے جبکہ اُس کی ماں اُسے کارخانے بھیجنے پر مُصر تھی یہ بہت گہرا زخم تھا جو ڈکنز کو نوعمری میں لگا جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکا۔

''میری روح کے پوشیدہ دکھ کے اظہار کے لیے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہوتے جب میں اپنے خوش کن بچپن کے ساتھیوں کا

موازنہ موجودہ ساتھیوں سے کرتا اور محسوس کرتا کہ میری عالم اور ممتاز
شخص بننے کی اُمیدیں میرے اندر دَم توڑ چکی ہیں۔ اس احساس کی
گہری یاد میرے اندر رہی کہ میں قطعی طور پر نظر انداز کیا گیا اور یہ بھی
کہ میں نا اُمید اور مایوس تھا۔ مجھے اپنی موجودہ حالت پر شرم آتی تھی
میرے معصوم دل کو دُکھ ہوتا تھا کہ جو کچھ میں نے سوچا سیکھا اور اس
سے جو خوشی میں نے پائی اور اپنے اندر بلند تخیل کے ساتھ آگے بڑھنے
کی خواہش میرے اندر ختم ہو رہی تھی جو کسی طرح واپس نہ آسکتی تھی۔
اس دکھ کو میں قلمبند کرنے سے قاصر ہوں (9)۔''

ڈکنز نے اپنے خاندان کی بے مصرف زندگی کے برعکس اولوالعزمی اور جفاکشی کو اپنایا۔ انہوں نے ایک معمولی سکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک وکیل کے ہاں کلرک کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں ڈکنز کو ایک بینکر کی بیٹی Maria Beadnell سے محبت ہوگئی لیکن اس لڑکی نے ڈکنز کو قلاش سمجھ کر اُس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔

''جب وہ وکیل کے پاس کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا تو پہلی
دفعہ وہ محبت میں گرفتار ہو گیا۔ Maria Beadnell ایک بینکر کی
بیٹی تھی جس نے ایک مفلس کلرک کے ساتھ زندگی گزارنے سے انکار کر
دیا۔ اس بات کا ڈکنز پر بہت گہرا اثر پڑا (10)۔''

ڈکنز کو اپنی محبت کا جواب نفرت میں ملا تو اُسے بہت دُکھ پہنچا۔ لیکن اُس نے محنت کو جاری رکھا۔ وکیل کے ہاں اُس نے شارٹ ہینڈ سیکھی اور بہت سے اخبارات کا رپورٹر بن گیا۔ اس عرصے کے دوران اُس کی زندگی میں شاندار قسم کی تبدیلی رونما ہوئی۔ اٹھارہ مہینوں کے اندر اندر اُس نے وکیل کے آفس کو چھوڑ دیا اور آزادانہ طور پر شارٹ ہینڈ کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن شارٹ ہینڈ ہی اُس کی واحد دلچسپی نہ تھی۔ اپنے فارغ اوقات میں وہ لندن کے تھیٹروں اور میوزک ہالوں میں بھی جاتا رہا اداکاری اُس کا مشغلہ تھا۔

بیس برس کی عمر میں ڈکنز برطانوی دارلعوام کی پریس گیلری میں رپورٹر بن گیا (11)۔ اُس کے

شریک کار کہنے لگے کہ اُس نے نہ صرف رپورٹنگ میں مہارت حاصل کر لی ہے بلکہ نقل نویسی میں بھی شاندار طور پر تیزی دکھائی ہے۔ ان کے نزدیک ایسا شارٹ ہینڈ رائٹر شاید ہی کبھی پیدا ہوا ہو۔ ڈکنز کی رپورٹ نویسی ادب کی تخلیق میں ممد و معاون ثابت ہوئی جس کی بدولت اُسے انسانی فطرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

''ڈکنز نے 1834ء میں قلمی نام Boz اختیار کیا اور مختلف جرائد میں چھوٹے مزاحیہ ''Sketches'' لکھنے شروع کئے (12)۔''

اُس کی ابتدائی تحریریں "Sketches of Young Gentleman", Sketches of Young Couples and the Mudfog Papers, صحافت کے بہترین نمونے کہلانے کی مستحق ہیں۔ اُس کی پہلی کتاب "Sketches by BoZ" کے نام سے 1836ء میں شائع ہوئی (13)۔ اس کتاب کی بدولت ڈکنز کو ولولہ انگیز مزاح نگار کے طور پر پزیرائی حاصل ہوئی۔ ڈکنز کی اس کتاب نے اُسے دنیا کے مزاحیہ ادب کا شاہکار بنا دیا۔

چوبیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ڈکنز بہت زیادہ شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ناول "Pickwick Papers" نے اُس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ پورے ادب کی تاریخ میں کسی بھی تخلیق کار کو ایسی شہرت حاصل نہیں ہوئی جو ڈکنز کو ملی۔

''ڈکنز کا ناول Pickwick Papers آغاز میں زیادہ مقبول نہ ہوا لیکن Sam Weller کو متعارف کرنے سے کئی ہزاروں کی تعداد میں یہ فردخت ہونے لگا۔ عوام میں Pickwick کے متعلق جوش پھیل گیا اور ڈکنز کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ بظاہر یہ ناول خاکوں کا ایک سلسلہ ہے جن کا باہمی تعلق ڈھیلا ڈھالا سا ہے یہ خاکے Samual Pickwick اور اس کے دوستوں کی مہمات کے بارے میں ہیں۔ پھر بھی کچھ بنیادی نظریات ہیں جو ناول میں وحدت کا سبب ہیں (14)۔''

Pickwick Papers کی عظیم کامیابی نے ڈکنز کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ بعد میں ڈکنز کی لکھی ہوئی ہر کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔

ڈکنز اعلیٰ پائے کا انگریزی ادیب تھا۔ اُس کا مقام لاثانی ہے اس وقت سے تا حال شاید ہی کوئی اُس جیسا ادیب پیدا ہوا ہو۔ اُس نے کروڑوں آدمیوں کے لیے لکھا۔ عظیم ادیبوں کی فہرست میں ڈکنز کا نام سرفہرست ہے۔ یقیناً اُس نے اپنی مضطرب اور ان تھک فطرت کی بدولت تمام ادیبوں پر سبقت حاصل کر لی۔ اس بات کا اظہار چارلس ڈکنز نے تین اپریل 1855ء کو مسز Marria Winter کے نام ایک خط میں کیا۔

''میں اپنی تخلیق کی اہلیت کو اپنی تمام زندگی پر غالب رکھتا ہوں بلکہ اس کا تو میرے اوپر مکمل قبضہ ہے۔ یہ تخلیقی حس مجھ سے اپنے مطالبات منواتی ہے اور بعض اوقات کئی مہینوں تک مسلسل مجھ سے ہر چیز کو دور کر دیتی ہے...... جو شخص آرٹ کا شیدائی ہو اُسے اپنے آپ کو مکمل طور پر اس میں جذب کر لینا چاہیے (15)۔''

ڈکنز نے چوبیس سال کی عمر میں شادی کر لی۔ لیکن میاں بیوی میں مکمل طور پر ذہنی ہم آہنگی نہ ہو سکی۔ جس کے باعث 1858ء میں دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔

''24 سال کی عمر میں ڈکنز نے Catherine Hogarth سے شادی کی جو اُس کے رفیقِ کار کی لڑکی تھی۔ شروع میں یہ شادی خوشی کا باعث بنی۔ ڈکنز کے ہاں دس بچے ہوئے۔ Catherine ایک نرم مزاج لیکن سست خاتون تھی۔ گھریلو انتظام سے ناواقف تھی اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے سے عاری تھی۔ شخصیتوں کے ٹکراؤ، ڈکنز کی مختلف مشاغل میں شرکت اور Ellen Ternan سے محبت کے نتیجے میں شادی کے بائیس سال بعد وہ نامساعد حالات میں اپنی بیوی سے علیحدہ ہوگیا (16)۔''

بعض نقادوں کے نزدیک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈکنز نے اپنی بیوی کو اس وجہ سے طلاق دی تھی کیونکہ وہ ایک ایکٹریس Ellen Ternen پر فریفتہ تھا۔ جو بعد میں اُس کی بیوی کے طور پر رہی۔ اُن کے رشتے کی اصل نوعیت ابھی تک باعثِ نزاع ہے(17)۔

ڈکنز کے ناولوں کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا لیکن اُس کے ناولوں کی بڑھتی ہوئی شہرت بھی اُس کی متحرک شخصیت کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہ تھی۔ وہ رسائل کو مدون کرنے کے ساتھ ساتھ ڈراموں میں ایکٹنگ بھی کرتا رہا۔ اُس نے انگلینڈ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کا سفر اختیار کیا۔ اِن ممالک کے دوروں سے اُس کو مختلف لوگوں کی فطرت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ اَن تھک حد تک محنتی تھا۔ اُس کی توانائی ہر قسم کے بندھن سے آزاد تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جسمانی طور پر توانا ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی طور پر توانا تھا۔ حقیقتاً اُس کی شخصیت ناقابل تقلید تھی۔ 58 برس کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے وہ 1870ء میں انتقال کر گیا۔ اور اُسے Westminister Abbey کے Poet's Corner میں دفنا دیا گیا(18)۔

چارلس ڈکنز عہدِ وکٹوریہ کا عظیم ناولسٹ تھا وہ غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا۔ اس کے ناول رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہے ڈکنز کے سلسلہ وار ناولوں کو جنوں کی حد تک پڑھا جانے لگا۔ اور عوام کی طلب میں مزید اضافہ ہوا۔ اگر عوام کو خوش کرنا ایک فن ہے تو ڈکنز کو اس فن میں بے مثل کہا جا سکتا ہے اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عوام کو خوش کرنے کے لیے نہ تو اُس نے منافقانہ رویہ اختیار کیا اور نہ ہی وقتی جذباتیت کو اُبھارا بلکہ وہ عوام اور عوام سے متعلقہ گردوپیش کے مناظر سے دلی طور پر منسلک تھا۔ اس صفت کی بدولت اُسے شیکسپیئر (19) سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈکنز کے ناول دائمی تازگی رکھتے ہیں۔ رسم و رواج کی تبدیلی اُن کے سحر انگیز تاثر کو فنا نہیں کر سکتی۔ اُن کے ناول مایوسی اور دکھ کے برعکس اُمید کی کرن پیدا کرتے ہیں۔ ڈکنز نہ صرف عہدِ وکٹوریہ (1837-1901ء) کے ناول نگاروں میں مشہور ہوا بلکہ وہ ہر دور کا ادیب ہے۔

زندگی کے زرخیز تجربات کے ساتھ ساتھ ڈکنز کی بطور رپورٹر اور ایکٹر کے تربیت اُس کو عظیم ناولسٹ بنانے کا باعث بنی جب ہم اُس کی ظاہری تربیت کا اُس کی باطنی تربیت سے موازنہ کرتے ہیں تو

ہمیں دو نمایاں اصول نظر آتے ہیں۔ ایک اُس کی حد سے بڑھی ہوئی تخلیقی حِس جس نے اُسے واقعات کے تناظر میں بہترین کہانیاں لکھنے پر اُکسایا۔ اِس تخیلی حِس نے اُس کے اندر زندگی کی تمام اشیاء کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ جس کی بدولت اُس کے ناولوں میں غنائیہ کیفیت پیدا ہو گئی۔ ان اشیا کا بغور جائزہ صرف ایک حساس انسان ہی لے سکتا ہے۔ عام لوگ اِن واقعات کی طرف توجہ دیے بغیر گزر جاتے ہیں۔ دوسرا عنصر ڈکنز کی حد سے بڑھی ہوئی حساسیت ہے جو دکھوں اور خوشیوں کے درمیان اپنا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ اس کی تمام کتابوں میں دکھ اور خوشیاں، دھوپ اور سائے کی طرح ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

چارلس ڈکنز نے بطور ناولسٹ کے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1836ء میں "Sketches by Boz" سے کیا۔ یہ ایک سلسلہ وار تخلیق تھی۔ جس میں لندن کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈکنز کی دوسری تخلیق "Pickwick Papers" نے عوام کی توجہ کو گرفت میں لے لیا اور اس کو ناول نگاری کی صف میں رہنما بنا دیا۔ یہ ناول 1836ء سے 1837ء تک سلسلہ وار چھپتا رہا۔ ڈکنز نے ایک ایسے ناول کی بنیاد رکھی جس نے برطانوی عوام میں نشاط انگیز ہنگامی کیفیت پیدا کر دی۔ یہ کتاب Pickwick اور اس کے ساتھیوں Winkle, Snodgrass, Tupman اور Samweller کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ کس طرح قسمت کی ستم ظریفی کی بدولت مشکلات کا شکار ہوتے ہیں۔ اور اِن مشکل مراحل کو تجربہ کار مہم جو Pickwick کی بدولت خوش تدبیری اور مہارت سے حل کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ساٹھ سے زیادہ مزاحیہ مناظر ہیں اور کرداروں کی تعداد 350 سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے کچھ کردار صرف ایک دفعہ صفحۂ قرطاس پر نمودار ہوئے ہیں لیکن وہ قارئین کے دلوں پر اپنا مستقل نقش ثبت کر گئے ہیں۔ ناول کے واقعات آپس میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں جڑے ہوئے ہیں لیکن اعلیٰ معیار کی تفصیل، مزاح میں زندہ دلی اور مناسب مشاہدہ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اس کتاب کو اعلیٰ درجے پر فائز کرتی ہیں۔

ابھی "Pickwick Papers" اپنی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بدولت تکمیل کے مراحل میں تھا کہ ڈکنز ایک رسالے "Bentley Miscellany" کا ایڈیٹر بن گیا۔ جس میں اس نے ناول "Oliver Twist" (1837-38) کو لکھنا شروع کیا۔ اس ناول کا مرکزی خیال بچپن کے غم اور دکھ کے مقابلے میں جرائم پیشہ افراد اور جیب کترے Fagin اور اُس کے رفیق جرم Monks, Bill Sikes اور Nancy کے کرداروں کو

اُجاگر کرنا ہے۔ ناول "Oliver Twist" مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی عکاسی کرتا ہے۔ "Oliver Twist" کی تکمیل سے پہلے ڈکنز نے اپنے ایک اور ناول "Nicholas Nickleby" (1838-39) کی اشاعت شروع کرا دی۔ یہ اصلاحی ناول تھا۔ اس ناول میں Yorkshire کے بیشتر سکولوں کے طریقہ تعلیم پر طنز کیا گیا ہے۔ یہ ناول Squeers جیسے ظالم اساتذہ پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ 1840ء میں ڈکنز نے متفرق مضامین پر مشتمل کتاب "Master Humphrey's Clock" لکھنا شروع کی جو اُس کی دوسری سلسلہ وار کتاب "Old Curiosity Shop" (1840-41) کے لیے بنیادی خاکہ ثابت ہوئی۔ اس ناول میں ڈکنز نے Nell نامی لڑکی اور اس کے دادا کی دردناک زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ جو اقتصادی مسائل کا شکار ہیں۔ ناول "Barnaby Rudge" (1841) تاریخی اور رومانوی ناول ہے۔ جو Gordon کی طرف سے Pope کے خلاف بغاوتوں کے متعلق ہے۔ یہ بغاوتیں 1780ء میں واقع ہوئی تھیں جنہوں نے انگلینڈ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس ناول میں بُرے اور گمراہ قیدیوں اور خودغرض عوامی اداروں کے درمیان تعلق کا معائنہ کیا گیا ہے۔

1842ء میں ڈکنز اور اس کی بیوی نے امریکہ کا سفر کیا۔ اس سفر کے نتیجے میں اُس نے ناول "Martin Chuzzlewit" (1843-44) لکھا۔ اس ناول کا شمار ڈکنز کے اعلیٰ معیار کے ناولوں میں نہیں ہوتا۔ بار بار پڑھنے سے بھی اس کے واقعات کی ترتیب ذہن نشین نہیں ہوتی۔ یہ ناول Martin Chuzzlewit کی امریکہ اور انگلینڈ میں مہمات پر روشنی ڈالتا ہے۔

ناول "Dombey and Son" (1846-48) غرور کے اثرات اور مزاج کے متکبرانہ انداز پر روشنی ڈالتا ہے۔ اگر "Martin Chuzzlewit" کا مقصد خودغرضی کو تمام بھیسوں میں منظر عام پر لانا تھا تو "Dombey and Son" کا موضوع فخر تھا۔ یہ ناول "Martin Chuzzlewit" کی نسبت زیادہ مربوط ہے اور ڈکنز کے ابتدائی ناولوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ڈکنز کے بعد کے لکھے گئے ناولوں میں "David Copperfield" اہم ناول ہے جو 1849ء سے 1850ء کے عرصے میں لکھا گیا۔ اس ناول کو ڈکنز کی خودنوشت سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ ڈیوڈ کی زندگی اور اُس کی مہمات حقیقت میں ڈکنز کی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ ناول میں معاشرتی اونچ نیچ، خوشیوں اور غموں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس ناول میں خوشیاں دائمی لے کا مقام رکھتی ہیں۔ ڈکنز کا ناول "Bleak House" 1853ء میں

شائع ہوا۔ یہ ناول ناجائز عدالتی قوانین خاص طور پر "Chancery" کی عدالت پر بھرپور طنز ہے۔ عدالتوں کی فیصلوں میں تاخیر اور غیر منصفانہ فیصلوں پر جتنے واضح انداز میں یہ ناول روشنی ڈالتا ہے عہدِ وکٹوریہ(1837-1901ء) کے کسی ناولسٹ کے ہاں نہیں ملتی۔ ڈکنز کا ناول "Hard Times" (1854ء) صنعت کاروں اور دولت کے پجاریوں پر بھرپور طنز ہے۔ ناول کے دو کردار Gradgrind اور Josiah Bounderby ڈکنز کے طنز کا نشانہ ہیں۔ یہ ناول مادی اشیاء سے نفرت دلاتا ہے اور انسانی زندگی میں روحانی اقدار کو بلند کرتا ہے۔ ناول "Little Dorrit"(1855-57) گورنمنٹ کی جیلوں اور قیدیوں کی طرف سے عدم توجہی اور بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار William Dorrit کو اپنی زندگی کے کئی سال Marshalsea کے قید خانے میں گزارنا پڑے William Dorrit کے تجربات کے ذریعہ جیل کی بدترین زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ گورنمنٹ کی، اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ قیدیوں کی تلخ اور دکھ بھری زندگی میں اُمید کی کرن اور زندگی گزارنے کی رمق پیدا کی جائے 1859ء میں ڈکنز نے انقلابِ فرانس کے پس منظر میں ایک ناول "A Tale of Two Cities" لکھا۔ ناول میں بتائے گئے دو شہر لندن اور پیرس ہیں۔ یہ ایسا انقلاب تھا جس نے پورے یورپ کو لرزہ براندام کر دیا تھا۔ اس ناول میں امرا اور نوابوں کے مظالم کو بے نقاب کیا گیا ہے جس کے سبب غریبوں کے دلوں میں امیروں کے خلاف نفرت شدید سے شدید تر ہوگئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ غریب عوام اُمرا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے یہ ناول ادبی اور تاریخی لحاظ سے بلند تر درجے کا حامل ہے۔

ڈکنز کے ناول "Great Expectations" (1860-61) ء میں قید خانہ نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ڈکنز کا یہ ناول طنزیہ اسلوب کا حامل ہے کیونکہ ناول کے ہیرو Pip کی معاشرے میں اعلیٰ مقام کی بنیاد ایک مجرم کی دولت پر ہے۔ اس ناول میں ڈکنز نے نجات کا مقام اچھے اور دیانتدارانہ کام پر رکھا ہے "Our Mutual Friend"(1864-65) ڈکنز کا آخری مکمل ناول ہے۔ اس ناول میں ڈکنز نے دولت کو پورے معاشرے کی خرابی کا باعث قرار دیا ہے۔ ڈکنز کی آخری تخلیق "The Mystery of Edwin Drood"(1870)ء ہے۔ یہ نامکمل ناول ہے۔ یہ ناول دوہری فطرت والے قاتل John Jasper کی ذاتی بیماری کے متعلق ہے ناول میں مجرم کو ایک دُکھی

انسان سمجھا گیا ہے جو اعلیٰ مرتبے سے گرنے کے باوجود ہمدردی کا مستحق ہو۔

''ڈکنز نے ان پندرہ ناولوں کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا۔ اس نے شاندار صحافیانہ مضامین پر مشتمل جلدیں، سفر ناموں کی دو کتب، کئی سو خطوط، کرسمس سے متعلق کہانیوں کی ایک کتاب اور بچوں کے لیے انگلینڈ کی تاریخ لکھی۔ ڈکنز نے تین جرائد کی اِدارت بھی کی۔ اِن میں سے دو، کئی سال تک اُس کے زیرِ ادارت رہے۔ علاوہ ازیں ڈکنز اپنے تمام Career کے دوران تھیئٹر کے کام میں مصروف رہا۔ وہ اکثر تھیئٹر جایا کرتا تھا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے پیشہ ور ایکٹر بننے کے بارے میں بھی سوچا۔ اُس نے ڈرامے لکھے اور شوقیہ طور پر ان میں ایکٹنگ بھی کی۔ ان ڈراموں میں اُس نے بطور ہدایت کار کے بھی کام کیا۔'' (20)

ڈکنز نے چونکہ اپنے دور کے حالات اور لوگوں کے متعلق لکھا ہے۔ اس لیے اُس دور کا سمجھنا انتہائی مفید ہے جس میں اُس نے زندگی بسر کی اور ادبی کام کیا۔

اُنیسویں صدی مسلسل تبدیلیاں رونما ہونے اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کا دور ہے۔ یہ دور مادی ترقی، سائنسی بیداری، جمہوری اصلاحات، صنعتی اور میکانکی ترقی کا دور تو تھا لیکن معاشرتی انتشار عہدِ وکٹوریہ (1837-1901ء) کی نمایاں خصوصیت بن چکا تھا صنعتی انقلاب جہاں صنعت کاروں اور مل مالکان میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہاں مزدوروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی تعداد میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر حیران تھے۔ انہیں نہ تو پیٹ بھر خوراک ملتی تھی اور نہ ہی رہنے کے لیے مناسب جگہ تھی۔ وہ گندے تاریک علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُمراء کے دل پتھر کے بن چکے تھے وہ معصوم بچوں سے اُن کی استطاعت سے بڑھ کر کام لیتے۔ یہی وجہ تھی کے غریب عوام ذہنی اور روحانی الجھنوں کا شکار ہو گئے۔ صنعتی انقلاب اگرچہ مال و دولت کی پیداوار تو کر رہا تھا لیکن انگلینڈ میں معمولات زندگی پر افسوسناک حد تک اثر انداز ہوا۔ شہروں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ کیونکہ لوگ

دیہاتوں سے ہجرت کر کے شہروں میں آباد ہو گئے۔ آئر لینڈ سے مفلس لوگوں نے ہجرت کی تو اس طرح ہزاروں محنت کش بیماری، بھوک و افلاس کا شکار ہو گئے۔ کارخانوں میں اشیاء بننے لگیں۔ جس کی وجہ سے کارکنوں کی ضرورت بہت حد تک کم ہو گئی۔ اور نتیجتاً بیروزگاری وقوع پذیر ہوئی محنت کشوں میں اضافے کی وجہ سے معاوضے میں کمی واقع ہو گئی۔ خاندان کے تمام افراد (چھوٹے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک) کو زندہ رہنے کے لیے فیکٹریوں، اُون کے کارخانوں، کوئلے کی کانوں اور کپاس کی ملوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ کارخانے کے مالک بچوں کا استحصال کرتے۔ معمولی سی رقم کی خاطر نو سال کے بچوں کو روزانہ بارہ سے چودہ گھنٹے ملوں میں کام کرنا پڑتا۔ وہ مشینوں سے چمٹے رہتے یا کوئلوں کی کانوں میں چھکڑوں کو کھینچتے پھرتے۔ ان کی انگلیاں زیادہ عمر والوں کے مقابلے میں چھوٹی اور پھرتیلی تھیں جس سے وہ کپاس اور اُون کو بڑی تیزی سے اکٹھا کرتی تھیں اس لیے مالکان بچوں کو ملازم رکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔

''انگلینڈ میں زندہ رہنے کے حالات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ (1800-1834) ء تک بیاسی فیصد کارکن جو ملوں میں کام کرتے تھے اُن کی عمریں گیارہ سال سے اٹھارہ سال تک کی تھیں۔ کئی محققین کے مطالعہ نے ثابت کیا کہ باسٹھ فیصد محنت کش جو ریشوں کی ملوں میں کام کرتے تھے انہیں تپ دق ہو گیا۔ فیکٹریاں باڑے کے احاطے میں موجود رقبے پر موجود ہوتیں جس میں حرارت اور ہوا کی آمد و رفت کا معقول نظام مفقود تھا۔

یہ صورتحال جب پارلیمنٹ کے سامنے پیش کی گئی تو کارکنوں کی حالت بہتر بنانے اور مفلسی کو انگلینڈ میں کم کرنے کے لیے اصلاحات کی پیش رفت ہوئی۔ 1802ء میں صحت کا قانون پاس ہوا جس کے تحت تمام زیرِ تربیت محنت کشوں کے لیے دو گھنٹے عمومی تعلیم بشمولہ صحت کے اصول مہیا کرنا تھا۔ 1819ء میں بچوں سے متعلق محنت کشی کا قانون پاس ہوا جس کے تحت پانچ سال سے گیارہ سال کے بچوں تک کے

لیے کام کرنے کے اوقات گیارہ گھنٹوں تک محدود کیے گئے۔ تاہم اس قانون پر عمل درآمد نہ ہوا۔

1833ء میں آزادی کے بل (Emancipation Bill) نے برطانوی نوآبادیوں کی غلامی کو ختم کر دیا...... اس کے باوجود صنعتی غلامی جاری رہی۔ اسی سال پہلا اہم فیکٹری لاء عمل میں لایا گیا جس نے نو سال سے کم عمر بچوں کو ملازم رکھنا غیر قانونی قرار دیا۔ اس قانون کے تحت اس بات پر زور دیا گیا کہ نو سے تیرہ سال کے بچے روزانہ نو گھنٹوں سے زیادہ کام نہ کریں۔ اکیس سال سے کم عمر لڑکوں اور تمام عورتوں کو رات کے وقت کام کرنے سے منع کیا گیا......

1834ء میں غریبوں کے قانون (The Poor Law) کو سختی سے ناپسند کیا گیا...... کیونکہ یہ کارکنوں کو اپنے خاندان سمیت کارخانوں میں رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ حقیقت میں وہاں رہنے کی حالت اتنی ناگفتہ بہ تھی کہ انہیں غریبوں کے قید خانوں سے تشبیہہ دی جاتی تھی۔ یہاں غربا کو گورنمنٹ کی خیرات پر انحصار کرنا پڑتا۔ اس ضمن میں Mr.Bumble ڈکنز کے ناول "Oliver Twist" میں ایک مثال ہے۔ اگر لوگ اس قانون کی مخالفت کرتے تو پھر انہیں چور بننا پڑتا یا بھوکوں مر جاتے۔ قید خانوں کی صورتحال کارخانوں یا Workhouses سے بھی بدتر تھی۔ مقروضوں کے قید خانے جیسے کہ ڈکنز کے ناول "David Copperfield" سے ظاہر ہے۔ ایک ایسی سزا تھی جو موت سے بھی بدتر تھی۔'' (21)

Philp Collins اپنی کتاب "Dickens and Crime" میں قیدیوں اور قید خانوں کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''اس صدی کی پہلی تین دہائیوں میں کوئی بھی قید خانہ ایسا نہیں تھا جہاں مناسب صفائی، ہوا کی آمد و رفت یا پانی کے نکاس کے لیے نالیوں کا انتظام موجود ہو........قیدی کی قسمت کا انحصار زیادہ تر اُس کی مالی حالت اور سفارش (Approach) پر تھا۔ بہت سے جیلر اور محافظ رشوت ستانی کا شکار تھے۔ بہت سے مفادات بکتے تھے۔ بعض اوقات تو قیدیوں کو قید سے بچ نکلنے کے مواقع مہیا کئے جاتے اور بہت زیادہ مفادات کے بدلے میں قیدیوں تک غیر قانونی سامان بھی پہنچایا جاتا تھا۔ مرد اور خواتین قیدی ایک ہی قید خانے، بعض اوقات ایک ہی عمارت یا کمرے میں مقید ہوتے اور قید خانے کے ملازمین استحقاق کے مطابق قیدیوں کا خیال نہ کرتے۔ وہ اکثر قیدیوں کا استحصال کرتے۔''(22)

Ivor Brown اپنی کتاب "Dickens In His Time" میں William Blake کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کی سیاسی صورتحال سے خائف تھا۔

''William Blake جو اسی دور کا شاعر اور صوفی ہے وہ بھی معاشرتی ڈھانچے کو دیکھنے کے لیے تیار تھا۔ اُس نے کہا کہ لندن کے باغ میں اُس نے فرشتوں کو دیکھا، اُس نے یہ بھی دیکھا کہ نئے صنعتی انگلستان میں، تاریک شیطانی ملوں میں شیطان اپنا کام کر رہا ہے۔ وہ دھوئیں والی فیکٹریوں کی بدنظمی، گندی تاریک گلیوں اور پسینہ بہانے والی مشقت کے خلاف تھا۔ جنہیں ڈکنز نے The Old Curiosity "Shop" میں سیاہ علاقے میں Nell کے پھرنے کے متعلق بیان کیا اور بعد میں "Hard Times" میں Mr.Bounderby کے Coke Town کی تصویر کو بیان کیا ہے۔ Blake بھی سیاست کا

طالب علم رہا تھا اور اُسے محسوس ہوا تھا کہ آمریت چاہے سیاست کے کسی
روپ میں ہی کیوں نہ ہو کا علاج ممکن نہیں بلکہ یہ قوم کی روح کی خرابی
ہے۔اُس نے اپنی رائے کو دو تلخ سطحوں میں لکھا ہے۔

'The Strongest poison ever known
came from Caesar's Laurel Crown'

سب سے زیادہ قوی زہر جس کی کوئی اور مثال نہیں ملتی سیزر کے جیت والے تاج سے آئی
ہے۔"(23)

رضی عابدی لکھتے ہیں:

"انیسویں صدی، مغرب میں دیرینہ قدروں کے ٹوٹنے کی
صدی ہے۔"(24)

ڈکنز بارہ سال کا تھا کہ اُس نے لندن میں روزانہ ہزاروں محنت کشوں کو غربت، مشقت اور بھوک میں دیکھا تھا جبکہ وہ Charing Cross کے قریب "Hunger Fort Stairs" کے مقام پر Warren کے Blacking Warehouse کی تاریک اور چوہوں سے بھری ہوئی عمارت میں کام کرتا تھا۔ڈکنز اُس میں زیادہ عرصہ نہیں رہا۔لیکن اُس دور کی تلخ یادیں اُس کی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ ان تلخ یادوں کا اثر اُس کی تحریروں پر واضح نظر آتا ہے۔ڈکنز نے لندن کی طوفان خیز صورتحال میں زندگی بسر کی جس میں تبدیلی اور انتشار زوروں پر تھا کیونکہ صنعتی انقلاب پیش قدمی کر رہا تھا۔آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔کارکنان اور اُن کے خاندان دیہات سے شہروں میں منتقل ہو رہے تھے جس کی وجہ سے جرم، محرومی، بیماریاں، غربت اور دکھ بڑھ گئے تھے یہ حیرت کی بات نہیں کہ انسانی دکھ میں شامل بچوں نے ڈکنز پر بطور مصنف اور معاشرتی مصلح بڑا اثر ڈالا۔ وجہ یہ تھی کہ ڈکنز کا بچپن بھی نہایت ناخوشگوار گزرا تھا۔ چنانچہ اس صدی کی ناانصافیوں اور معاشرتی دشواریوں کو اُس نے نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔

تقابلی مطالعہ کے ضمن میں ہمارے دوسرے ناول نگار شوکت صدیقی 20 مارچ 1923ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق روہیل کھنڈ، یوپی کے ضلع بریلی سے تھا۔ اُن کے دادا عبدالعزیز وکیل تھے۔شوکت صدیقی کے والدِ الطاف حسین اٹھارہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

مولوی عبدالعزیز کے بھائی مولوی عبدالحسیب لاولد تھے چنانچہ مولوی عبدالعزیز کے انتقال کے بعد وہ الطاف حسین کو اپنے ساتھ بریلی سے اجمیر لے آئے اور اُن کی پرورش بھرپور توجہ سے کی۔ مولوی عبدالحسیب پولیس کے محکمے میں تھانے دار تھے۔ الطاف حسین نے مڈل تک تعلیم حاصل کی اور چچا کی خواہش پر پولیس کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔شوکت صدیقی کے ننھیال کا تعلق اجمیر سے ہے اُن کے نانا عبدالرحیم خان محکمہ پی ڈبلیو ڈی میں اوورسیئر تھے۔ مولوی عبدالحسیب اور عبدالرحیم خان گہرے دوست تھے۔ چنانچہ مولوی عبدالحسیب نے عبدالرحیم خان کی بیٹی ننھی بیگم کی شادی مولوی الطاف حسین سے کر دی۔ ننھی بیگم سادہ خاتون تھیں اُنہوں نے گھر کی چار دیواری میں رہ کر دینی تعلیم حاصل کی تھی۔شوکت صدیقی کے والد الطاف حسین مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے جس کی بنا پر اُنہوں نے پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کے اس اقدام کو اُن کے چچا نے ناپسند کیا۔ نتیجتاً وہ اجمیر کو خیر باد کہہ کر لکھنو آباد ہو گئے۔ لیکن لکھنو میں اُنہیں ملازمت کے سلسلہ میں بہت تگ و دو کرنا پڑی۔ مولوی الطاف حسین کے بہنوئی سردار ولی خان لکھنو میں لکڑیوں کا کاروبار کرتے تھے۔ الطاف حسین بھی اپنے بہنوئی کے کاروبار میں شریک ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد اُنہوں نے پاکستان ہجرت کی اور 1960ء میں کراچی میں انتقال کیا۔

الطاف حسین اور ننھی بیگم کے ہاں پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ آٹھ بہن بھائیوں میں شوکت صدیقی چھٹے نمبر پر ہیں۔ اُن کی تعلیم کا آغاز اس زمانے کے رواج کے مطابق روایتی انداز میں ہوا شوکت صدیقی کو امام حافظ عبدالکریم نے ناظرہ قرآن پڑھایا اور پھر اُنہوں نے حافظ عبدالکریم کے کہنے پر قرآن پاک کے کچھ پارے مدرسہ فرقانیہ میں حفظ کیے۔ اسی دوران میں اُنہیں یحیٰ گنج درنا پرائمری سکول میں درجہ اول میں داخل کرا دیا گیا۔ تو حفظ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔شوکت صدیقی انتہائی ذہین طالب علم تھے

لیکن اُن کی تعلیمی زندگی میں تسلسل نہ رہا جب اُنہوں نے جوبلی ہائی سکول لکھنو سے ساتویں جماعت (1930 تا1936ء) کا امتحان پاس کیا تو اُن کے بڑے بھائی حامد حسین صدیقی جوانجینئر تھے اور کان پور میں ملازم تھے اُنہیں اپنے ساتھ کان پور لے گئے اور نواب گنج ہائی سکول میں آٹھویں جماعت میں داخل کرادیا۔ شوکت صدیقی نے جماعت ہشتم کا امتحان (1937ء) نواب گنج ہائی سکول کان پور سے پاس کیا۔ کان پور میں اُن کا قیام عارضی رہا۔ وہ دوبارہ لکھنو آ گئے اور اسلامیہ ہائی سکول لکھنو سے 1938ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد اُنہوں نے انٹرمیڈیٹ کے لئے لکھنو کرسچیئن کالج میں داخلہ لیا۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر وہ کالج میں ریگولر پڑھائی جاری نہ رکھ سکے آخر کار 1940ء میں اُنہوں نے پرائیوٹ اُمیدوار کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔ بی اے کے لیے سفاتن دھرم کالج میں داخلہ لیا لیکن یہاں بھی با قاعدہ طالب علم کی حیثیت سے اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکے اور 1944ء میں پرائیویٹ اُمیدوار کی حیثیت سے امتحان دیا اور بی۔ اے میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔

شوکت صدیقی کو بچپن سے علم وادب سے لگاؤ تھا۔ اُنہوں نے سترہ سال کی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے والد الطاف حسین کو بھی مطالعہ کا شوق تھا۔ اور اُن کے پاس اردو کے چند کلاسیکی ادیبوں کی تخلیقات موجود تھیں جن سے شوکت صدیقی نے بھی استفادہ کیا۔

> ''میرے والد کو بھی مطالعہ کا شوق تھا۔ لائبریری تو اُن کی کوئی با قاعدہ نہ تھی مگر ان کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ جن سے میں برابر فیض یاب ہوتا رہا۔ لڑکپن میں ہی عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول، فسانۂ آزاد، ڈپٹی نذیر احمد کے قریب قریب تمام ناول ہی، منشی فیاض علی کے ناول شمیم اور انور، منشی پریم چند کے ناول، گئودان، میدانِ عمل، چوگانِ ہستی، شبلی نعمانی کی الفاروق۔ یہ اور ایسی ہی دوسری علمی وادبی کتب خصوصیت کے ساتھ ناول اور داستانیں حتیٰ کہ طلسم ہوشربا اور داستان امیر حمزہ ایسی واہیات اور لغو داستانیں بھی

پڑھ ڈالی تھیں ۔ اس کے علاوہ نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش کے رومانی اور عشقیہ افسانوں کے ساتھ ساتھ پریم چند، علی عباس حسینی اور ڈاکٹر اعظم کریوی کے سماجی اور اصلاحی افسانوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ان اہلِ قلم کی تصانیف نے میرے ذہن کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔'' (25)

اِن تمام نامور ادیبوں کو پڑھنے کے بعد شوکت صدیقی نے بھی اپنی ذہنی اُپج کو بروئے کار لا کر افسانے لکھنے شروع کئے ۔ اُنہیں نصاب کی کتابوں کو پڑھنے کی بجائے ادبی رسائل پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ خاص طور پر افسانے بے حد پسند تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی افسانے لکھنے شروع کئے اور ہفت روزہ ''خیام'' میں شائع کرانے کے لیے بھجواتے رہے۔ اُن کے افسانے اسی رسالے میں شائع بھی ہوئے۔

''ساٹھ اکسٹھ سال پرانی بات ہے۔ غور کرتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے۔ طالب علمی کا زمانہ تھا۔ کالج میں گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ ان دنوں نصاب کی کتابوں کی بجائے ادبی جرائد نہایت ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ افسانے زیادہ زیرِ مطالعہ تھے ایک روز میرے سر میں بھی سودا سمایا اور ایک عدد افسانہ لکھ ڈالا۔ گھر میں لاہور سے ہفت روزہ ''خیام'' آتا تھا۔ افسانہ مکمل کر کے ''خیام'' کو روانہ کر دیا کچھ عرصے بعد وہ چھپ کر آ گیا۔ اس وقت خیام کے مدیر عبدالرحیم شبلی تھے لیکن کچھ تو اُن کی حوصلہ افزائی اور کچھ تخلیقی لگن، جلد ہی دوسرا افسانہ بھی لکھ ڈالا۔ یہ بھی نیم رومانی نیم سماجی افسانہ تھا ایسے میں نے کئی افسانے لکھے۔ اب تو اُن کی تعداد بھی یاد نہیں ۔ نہ میرے پاس اُن کی نقل ہے نہ تراشے۔ چنانچہ میرے کسی افسانوی مجموعے میں یہ افسانے شامل نہیں''۔ (26)

شوکت صدیقی کو ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ اُنہوں نے قدرت کی طرف سے عطا کردہ اس صلاحیت

کو اکتساب سے چمکایا۔ شوکت صدیقی کو زمانۂ طالب علمی میں دو علمی و ادبی شخصیتوں خواجہ عبدالرؤف عشرت اور حیات اللہ انصاری کا قرب حاصل رہا۔ ان ادیبوں کی رفاقت میں اُنہیں قدیم ادب کو سمجھنے کا موقع ملا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران شوکت صدیقی نے فوج کی ملازمت اختیار کرلی۔ 43-1940ء تک فوجی ملازمت سے منسلک رہے لیکن انہیں یہ ملازمت پسند نہ آئی۔ کیونکہ وہ ادبی ذوق رکھتے تھے اس لیے اُنہوں نے فوج کی ملازمت کو ترک کردیا۔ 1946ء میں اُنہوں نے لکھنو یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔ شوکت صدیقی اپنی ذہنی تسکین کے لیے پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مرزا ادیب، سہیل عظیم آبادی اور عصمت چغتائی کو متواتر پڑھتے رہے۔ اِن ادیبوں کو پڑھنے سے اُن کے اندر کا ادیب جاگ اٹھا۔ شوکت صدیقی نے اردو ادب کے ساتھ جن مغربی ادیبوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں ہارڈی، ڈکنز، ہمینگوے، گورکی، موپساں، چیخوف، اور دوستوفسکی سرِ فہرست ہیں۔ ان ادیبوں کی تخلیقات کے مطالعے سے اُن کے ذہن میں وسعت پیدا ہوئی۔

شوکت صدیقی نے ادبی جرائد میں بطور مدیر کے بھی کام کیا وہ لکھنو سے جاری ہونے والے ماہنامہ ''ترکش'' کے شریکِ مدیر رہے۔ جس کی بدولت اُنہیں نامور ادیبوں کی صحبت سے فیض اُٹھانے کا موقع ملا۔

> ''1944ء کے آغاز میں میرے دوست علی مظہر رضوی نے لکھنو سے ماہنامہ ''ترکش'' نکالا وہ ایک ادبی رسالہ تھا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں علی مظہر رضوی مرحوم کے علاوہ میں بھی بحیثیت مدیر شامل تھا۔ اس رسالے کے لیے مضامین نظم و نثر حاصل کرنے کی غرض سے ادیبوں اور شاعروں سے ملنے جلنے اور قریب ہونے کا بخوبی موقع ملا۔ ماہنامہ ''ترکش'' کے صرف دو شمارے شائع ہوئے مگر اس کے وسیلے سے لکھنو کے قریب قریب تمام ہی قابلِ ذکر اہلِ قلم سے اس حد تک مراسم ہو گئے کہ اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ان ادیبوں اور شاعروں میں ڈاکٹر عبدالعلیم، اسرار الحق مجاز، سلام مچھلی شہری، پروفیسر احتشام حسین، علی جواد زیدی، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر عبادت بریلوی، کمال

احمد رضوی، منظر مسلم، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور کتنے ہی دوسرے شامل تھے۔'' (27)

شوکت صدیقی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ہفت روزہ نشستوں میں بھی شرکت کی اور افسانے پڑھے اُن کے افسانوں پر تنقید بھی ہوئی جس سے اُن کے ادب کو جلا ملی۔ اُنکی انجمن ترقی پسند مصنفین سے مستقل وابستگی ماہنامہ ''ترکش'' کے مدیر علی مظہر رضوی سے دوستانہ تعلق کی بنا پر بڑھی۔

''ماہنامہ ''ترکش'' تو دو ہی مہینے بعد بند ہو گیا مگر علی مظہر رضوی سے اتنے گہرے دوستانہ مراسم ہو گئے جو ان کے انتقال تک بخیر و خوبی برقرار رہے۔ مظہر رضوی ذہنی طور پر سوشلزم سے متاثر تھے۔ لہٰذا کمیونسٹ پارٹی سے اُن کا خاصا ربط خبط تھا حتیٰ کہ وہ پارٹی کے کل وقتی رکن بن گئے کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ اس حد تک تعلق پیدا ہو گیا کہ میں پارٹی کا قریبی ہمدرد اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ میں اُس کا باقاعدہ جز وقتی (پارٹ ٹائم) رکن بن گیا۔ چند ماہ جیل میں بھی رہا۔ اسی نظریاتی رشتے کی بنیاد پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہا۔ انجمن کی تنقیدی نشستوں میں پابندی سے شرکت کرتا رہا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی ترقی پسند تحریک سے میری وابستگی برقرار رہی۔'' (28)

شوکت صدیقی 1950ء میں پاکستان آ گئے لیکن یہاں اُنہیں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن پر غیر یقینی اور اُمید و بیم کی کیفیت طاری رہی کیونکہ اُن کے پاس نہ رہنے کیلئے مناسب جگہ تھی اور نہ ہی معاش کا ذریعہ۔ اُنہیں کراچی میں جرائم پیشہ افراد کے ساتھ وقت گزارنا پڑا ان جرائم پیشہ لوگوں کو اُنہوں نے بہت قریب سے دیکھا اور اُن کی نفسیات کا مطالعہ کیا۔ بعد میں یہی افراد اُن کے افسانوں اور ناولوں کا بنیادی موضوع بنے۔

''میں ستائیس برس کا تھا جب میں نے لکھنو چھوڑا اور کراچی

آیا۔ اس زمانے کا کراچی آج کے کراچی سے بالکل مختلف تھا۔ جہانگیر روڈ پر شہر ختم ہو جاتا تھا۔ بیشتر آبادی فٹ پاتھوں، جھگیوں اور خیموں میں آباد تھی۔ مختلف قماش کے لوگ یکجا ہو گئے تھے۔ نئی نئی زندگی اور نئے ماحول میں پاؤں جمانے کے لیے لوگ کوشاں تھے۔ میں نے بھی اس زندگی کا قریبی مشاہدہ کیا۔ میرے اردگرد پھیلے ہوئے ایسے لوگ بھی تھے جو بعد میں میری کہانیوں کا موضوع بنے۔'' (29)

''کراچی آنے کے بعد اس شہر کے ماحول سے براہِ راست متاثر ہوا۔ یہ شہر بہت جلد بہت سے شہروں کا مجموعہ بن گیا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے میرا واسطہ پڑا۔ اس دور کی میری کہانی ''تیسرا آدمی'' میری نمائندہ کہانی ہے۔ مفلوک الحال لوگوں اور جرائم پیشہ افراد سے اکثر سابقہ پڑا۔ میں نے اُن کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا اس لیے یہ کردار میری تحریروں میں بلا ارادہ چلے آتے ہیں۔'' (30)

ایک رومانی حادثہ اُنہیں پاکستان لایا تھا۔ لیکن وہ اپنی محبت کے حصول میں ناکام رہے۔ 1952ء میں انکے ماموں کی رضامندی سے اُن کی شادی محترمہ ثریا بیگم کے ساتھ ہوگئی۔ اُن کے ہاں تین بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

پاکستان آنے کے بعد اُنہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا وہ 54-1952 تک ''پاکستان سٹنڈرڈ'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ 60-1954ء تک ''روزنامہ ٹائمز آف کراچی'' کے سب ایڈیٹر رہے۔ 63-1960ء تک ''مارننگ نیوز'' کراچی کے سب ایڈیٹر رہے۔ 66-1963 تک روزنامہ ''انجام'' کے ایڈیٹر رہے اور بعد میں چیف ایڈیٹر مقرر کر دیئے گئے۔ 73-1969ء کے دوران ہفت روزہ ''الفتح'' کے نگرانِ اعلیٰ کے طور پر کام کیا۔ 79-1973ء تک روزنامہ ''مساوات'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔ 1984ء میں صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اب تخلیق ادب پر توجہ مرکوز ہے۔

شوکت صدیقی نے ان صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں کو بھی جاری رکھا۔ اُن کے

چار افسانوی مجموعے، ایک ناولٹ اور تین ناول اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''کمین گاہ'' ناولٹ (1945ء)، ''تیسرا آدمی'' افسانے (1952ء)، ''اندھیرا اور اندھیرا'' افسانے (1955ء)، ''راتوں کا شہر'' افسانے (1956ء)، ''خدا کی بستی'' ناول (1957ء)، ''کیمیا گر'' افسانے (1984ء)، ''چار دیواری'' ناول (1988ء)، ''جانگلوس'' ناول (1989ء) شامل ہیں۔

اُن کے ناول ''جانگلوس'' اور ''چار دیواری'' رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہے جنہیں بعد میں کتابی صورت دے دی گئی۔ شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' کے ۴۷ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ ناول اردو ادب کے شاہکار ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ دنیا کی چھبیس مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس ناول کو پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔ شوکت صدیقی کو 1960ء میں ناول ''خدا کی بستی'' پر آدم جی ادبی انعام دیا گیا۔ ''جانگلوس'' لکھنے پر اُنہیں حکومت نے 1997ء میں پرائڈ آف پرفارمنس کے ایوارڈ سے نوازا۔ 2003ء میں انہیں ان کی ادبی خدمات کے صلے میں ستارۂ امتیاز دیا گیا۔

شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' اور ''جانگلوس'' میں پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ ان ناولوں میں غریبوں کے استحصال کو بنیادی موضوع بنایا گیا ہے۔ ''خدا کی بستی'' میں پاکستان بننے کے فوراً بعد ہمارے وطن کی حالتِ زار کی تصویر کشی کی ہے۔ اور ''جانگلوس'' پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ پر محیط ہے۔ وطن پاکستان میں تقریباً نصف صدی کے دوران میں اعلیٰ طبقہ کی طرف سے ادنیٰ طبقہ کا استحصال اور زیر دستوں پر وڈیروں اور جاگیرداروں کے مظالم کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ ناولٹ ''کمین گاہ'' اور ناول ''چار دیواری'' ہندوستان کی معاشرتی حالت کی متحرک تصویریں ہیں شوکت صدیقی کے افسانوں پر بھی ان کی ناولوں کی چھاپ ہے۔ ان کے افسانے بھی معاشرتی استحصال کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور احمد لکھتے ہیں۔

> ''اُنہوں نے ہمیشہ غربت، استحصال، جہالت اور محلاتی سازشوں کے خلاف قلم اُٹھایا...... وہ ہماری اجتماعی زندگی کا بے رحم مفسر، مبصر اور ناقد ہے۔ اُس نے جہاں نچلے طبقات پر ڈھائے جانے والے مظالم کی کہانی لکھی ہے وہاں متوسط طبقے سے ابھرنے والی ترقی پسند قیادت کے تضادات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اس نے جہاں سرکاری

کارندوں کی لوٹ کھسوٹ کا نقشہ کھینچا ہے، وہاں انسان دوست دانشوروں کی سہولت پسندی کے نتائج پر بھی نظر رکھی ہے۔ اسے احساس ہے کہ وسائل دولت پر ایک طبقے کی اجارہ داری، دولت کی نامنصفانہ تقسیم اور عوامی محرومیوں سے بے تعلق مذہبی اور سیاسی پیشوا جس طرح کے معاشرے کو پروان چڑھاتے ہیں، وہاں بچوں کو قوم کا مستقبل تو کہا جاتا ہے، مگر اُنہیں تعلیم و تربیت کے مواقع فراہم نہیں کئے جاتے۔ وہاں حق، انصاف اور شرفِ آدمیت کے نعرے اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ کولہو کے بیلوں کا لہو سرد نہ ہونے پائے۔ وہاں آزادی کے تحفظ کی قسمیں کھائی جاتی ہیں مگر امورِ مملکت کا ٹھیکہ سامراجی ملکوں کو دے دیا جاتا ہے''۔(31)

شوکت صدیقی نے بچوں، بڑوں اور خواتین کے دُکھ کو بیان کیا ہے۔ اُنہوں نے غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے انو، نوشا، راجہ، شامی جیسے معصوم بچوں کی تصویر کشی کی ہے۔ رضیہ کو نیاز کے ہاتھوں Slow Poisoning سے موت کی نیند سلانے کا منظر عیاں کیا گیا ہے۔ پاکیزہ ذہن سلطانہ کی بے عزتی اور رسوائی کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ لکھنو اور دہلی کی تاریکیوں اور پستیوں کو ظاہر کیا ہے۔ ظلم کی چکی میں پستے ہوئے محنت کشوں کی آواز کو دبانے کے لیے اُمرا کے حربوں کو بیان کیا گیا ہے۔ انسان پر انسان کے تشدد کو ابنِ آدم کی المناک داستان کی صورت دی گئی ہے۔

شوکت صدیقی کے ناول اور افسانے زندگی کی تلخیوں اور ظلم و جبر کے خلاف منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شوکت صدیقی کے فن کو سمجھنے کے لیے اُس دور کو جاننا انتہائی ضروری ہے جس میں اُنہوں نے آنکھ کھولی۔ جس زمانے میں وہ پیدا ہوئے اُس وقت ہندوستان کے عوام غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ ان زنجیروں کو توڑنے کے لیے شدت سے مضطرب تھے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں مسلمانوں کو شاہین قرار دیتے ہوئے اُنہیں کشمکشِ حیات میں مستعد رہنے کی تلقین کی۔ اور اُنہیں اپنے اسلاف کے سنہری دور کی یاد دلائی۔ اُن میں جدوجہد کی تڑپ پیدا کی۔ مولانا ظفر علی خان نے اپنی شاعری میں اِسلام سے محبت

کے پہلو کو اُجاگر کیا۔ مولانا حالی نے مسلمانوں کے اندر اِسلامی جذبے کو جلا دینے کی کوشش کی۔

شوکت صدیقی نے ہوش سنبھالا تو سیاسی اور مذہبی تحریکیں زور پکڑنے لگیں اور آزادی کا جذبہ بڑھتا چلا گیا جبکہ ہندو مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اکھنڈ بھارت کو گاؤ ماتا سے تشبیہہ دیتے تھے اور برصغیر پاک و ہند کو تقسیم کرنے کے خلاف تھے۔ پاکستان بالآخر 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر نمودار ہو گیا۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ اُن کے گھروں کو آگ لگائی۔ پاکستان کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے قافلوں کو تہہ تیغ کر دیا اور ٹرینوں میں سوار مسلمانوں کو خنجروں اور کرپانوں سے ذبح کر دیا بے شمار خاندان اُجڑ گئے اُن کی لاشوں کو چیلوں اور کوؤں نے کھا لیا۔ اُنہیں قبریں نصیب نہ ہوئیں۔ پاکستان تک پہنچتے پہنچتے اُن کا جانی و مالی نقصان اتنا زیادہ ہوا کہ کسی طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستانی حکومت کے لیے اُن کی آبادکاری کا مسئلہ پیدا ہوا۔ خستہ حال مہاجرین سرزمینِ پاکستان کو جنت سمجھ کر آئے تھے مگر یہاں اُنہیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنہوں نے ہندوستان میں چھوڑی ہوئی اپنی جائیدادوں کے Claim محکمہ بحالیات کے دفاتر میں جمع کرائے تو اُنہیں کئی کئی چکر کاٹنے پڑتے اُن میں سے اکثر Clamants کی حق تلفی بھی ہوئی۔ بحالیات کے دفتر کا منظر روزِ محشر جیسا تھا جہاں مہاجرین کا ہجوم لگا رہتا۔ لوگ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور کلرکوں کے پاس کئی کئی گھنٹے روزانہ کھڑے رہتے۔ پاکستان کا وجود میں آنا گویا ایسا انقلاب تھا جس نے کئی خاندانوں کو ملیامیٹ کر دیا بحالی آبادی کا Process کئی سال جاری رہا۔ ڈاکٹر نجم الاسلام لکھتے ہیں:

''آزادی کے بعد اس ملک کے حق میں ابتلا و آزمائش کا ایک
باب کھل گیا۔ اپنے دلوں میں لوگوں نے شدت محسوس کرنا شروع
کر دیا کہ منزل مقصود ابھی نہیں آئی۔ منزل ابھی نہیں آئی۔''(32)

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی عوام کا استحصال جاری رہا۔ اب استحصال کرنے والے انگریز یا ہندو نہ تھے بلکہ مسلمان خود دوسرے مسلمان کا استحصال کرنے میں پیش پیش تھے۔ اب عوام پر ظلم جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی طرف سے ہوا۔ زمیندار اور جاگیردار مزارعین کو اپنا

غلام سمجھتے تھے۔ مزارعوں کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ وہ جاگیرداروں کے مظالم کا شکار رہتے۔ زمینداروں کو اپنے علاقوں میں سکولوں کی موجودگی پسند نہ تھی چنانچہ وہ استادوں کو سکول سے دور رکھتے اور سکولوں میں اپنے مال مویشی رکھ لیتے یا پھر سکولوں کو بیٹھک کے طور پر استعمال کرتے اُنہیں غریب مزارعوں کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ دیکھنا ناپسند تھا۔'' زمیندار چاہتے تھے کہ مزارع جاہل رہیں اور ہمیشہ اُن کے غلام بنے رہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر زمیندار اپنے مزارعوں کو مارتے پیٹتے اور اُنہیں طرح طرح کی سزائیں دیتے مثال کے طور پر چارپائی کے پائے تلے کسی مزارع کی ہتھیلی رکھ دینے کے بعد چارپائی پر زمیندار بیٹھ جاتا اور غریب مزارع کرب سے روتا، چیختا، کراہتا اور سسکیاں لیتا اور زمیندار اس کی دکھ بھری آوازوں سے لطف اندوز ہو کر دل بھر کر ہنستا اور خوش ہوتا۔ اُسے مظلوم کے رونے کی آواز بانسری کی سریلی دھنیں محسوس ہوتیں۔ چوری، اغوا، قتل اور دیگر جرائم کرنے کے لیے زمینداروں نے بدقماش آدمیوں کو پال رکھا تھا۔ اُن کے ہاتھوں کسی کی عزت محفوظ نہ تھی۔ زمیندار اور وڈیرے پولیس سے ملے ہوئے ہوتے تھے۔ وکیل انجم لکھتے ہیں۔

> '' فیچر رائیٹر کی حیثیت سے مجھے ملک کے پچانوے فیصد لوگوں کے کرب، دکھ اور المیوں کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ کوشش کے باوجود روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد نہیں ہو رہے جبکہ دوسری طرف اقتدار و اختیار کے تمام سوتے جاگیرداروں کے بنائے ہوئے اصول وضوابط سے پھوٹتے ہیں......ملک کی سیاست پر قابض یہ طبقہ کسی بھی سیاسی نظام کو چلنے نہیں دیتا۔ یہی مٹھی بھر لوگ غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے پُرفریب نعروں سے سادہ لوح غریب عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔''(33)

دوسری طرف کارخانہ داروں اور صنعت کاروں نے مزدوروں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اُنہیں اپنی محنت کا سواں حصہ بھی بمشکل ملتا۔ یہ مظلوم اپنے دن بھر کی کمائی سے ایک وقت کی روٹی بھی بمشکل حاصل کر سکتے تھے۔ تنگ آکر اگر کبھی وہ احتجاج کرتے تو اُن پر لاٹھیاں برسائی جاتیں اور اُنہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتیں۔ اُن کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی اور ان کی روزانہ کی آمدنی میں مزید تخفیف کر دی

جاتی۔ ایسے دکھیاروں کا پرسانِ حال کوئی نہ ہوتا اور پھر وہ مجبوراً ظلم کی اسی بھٹی میں جلنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ شوکت صدیقی نے اپنے ناولٹ ''کمین گاہ'' میں اسی صنعت کار طبقے کی عکاسی کی ہے جو اپنے کارندوں کے ذریعہ مزدوروں کے جائز حقوق پامال کراتے ہیں اور مزدوروں کو اپنا پیدائشی غلام سمجھتے ہوئے اُن پر ہر طرح کا ظلم روا رکھنا جائز سمجھتے ہیں۔ شوکت صدیقی لکھتے ہیں:

> ''استحصال کرنے والے طبقات ایک بار پھر برسرِ اقتدار آ گئے صرف چہرے اور نام بدل گئے۔ ہندو سرمایہ دار اور ساہوکار بھارت چلے گئے اور برطانوی نوآبادکار اپنی انگریز نوکر شاہی کے ساتھ برطانیہ گئے ان کی جگہ مسلمان جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور مسلم نوکر شاہی نے لے لی۔ استحصال کا یہ سلسلہ ختم ہونے کے بجائے زیادہ بے رحم اور شدید ہو گیا۔''(34)

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے حالاتِ زندگی اور عہد سے آگاہی کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ادیبوں میں بہت زیادہ مماثلت ہے۔ دونوں کو بچپن سے مطالعہ کا شوق تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے دور کے ادب اور کلاسیکی ادب کے مطالعہ کے بعد خود بھی لکھنا شروع کیا دونوں ادیبوں نے اپنے ناولوں میں ظالم اور مظلوم کے درمیان کشمکش اور استحصال کو واضح کیا ہے۔ شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز دونوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ دونوں کے ناول رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہے۔ دونوں ناول نگاروں نے جرائم پیشہ افراد کی عکاسی اپنے ناولوں میں کی ہے۔ دونوں ناول نگاروں نے تشدد، پُراسراریت اور مشکوک قسم کے لوگوں کو ناول کے پس منظر میں گھات لگائے دکھایا ہے۔ اس تمام مماثلت کے باوجود دونوں میں گہرا فرق بھی موجود ہے چارلس ڈکنز معاشرتی مسائل کی عکاسی اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ماضی کی کہانی بن جائے گی۔ اور سچائی اور اچھائی اس کی جگہ لے لے گی۔ جبکہ شوکت صدیقی کے ہاں وہ اُمید اور Optimism نہیں پائی جاتی جو ڈکنز کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔ دونوں میں یہ فرق اُن کے اپنے اپنے عہد کی پیداوار ہے۔ شوکت صدیقی غلام قوم کا فرد ہے۔ جبکہ ڈکنز حاکم قوم کا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ادیبوں کے نظریۂ حیات میں واضح فرق ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1- Ivor Brown "Dickens in His Time", P.1, Thomas Nelson and Sons LTD, 1965.

2- Charles Dickens "The Mystery of Edwin Drood", Oxford University Press, 1982.

3- Martin Fido "Profiles in Literature", P.2, London Routledge & Kegan Paul, 1968.

4- Califf's Notes, Dickens Pickwick Papers Notes, P.5, C.K.Hillegass U.S.A, 1970.

5- Martin Fido "Profiles in Literature", P.2.

6- Dickens Pickwick Papers Notes, PP.5,6.

"In the light of the family's move back to London, where financial calamity overtook the Dickenses, the time in Chatham must have seemed glorious indeed. The family moved into the shabby suburb of Camden Town, and Dickens was taken out of school and set to menial jobs about the household. In time, to help augment the family income, Dickens was given a job in a blacking factory among coarse companions."

7۔ Charles Dickens "David Copperfield", PP.58-59, Thomas Nelson and Sons LTD.

"My father had left a small collection of books in a little room upstairs, to which I had access (for it adjoined my own), and which no body else in our house ever troubled. From that blessed little room, Roderick Random, Peregrine Pickle, Humphrey Clinker, Tom Jones, the Vicar of Wakefield, Don Quixote, Gil Blas, and Robinson Crusoe, came out, a glorious host, to keep me Company.

They kept alive my fancy, and my hope of something beyond that place and time ...... they, and the Arabian Nights, and the Tales of the Genii ...... and did me no harm; for whatever harm was in some of them was not there for me ...... I know nothing of it. It is astonishing to me now how I found time, in the midst of my porings and blunderings over heavier themes, to read those books as I did. It is curious to me how I could ever have consoled myself under my small troubles (which were great troubles to me), by impersonating my favourite characters in them ...... I have been Tom Jones (a child's Jom Jones, a harmless creature) for a week together.

I have sustained my own idea of Roderick Random for a month at a stretch, I verily believe. I had a greedy relish for a few volumes of voyages and Travels ...... I forget what, now ...... that were on those shelves; and for days and days I can remember to have gone about my region of our house, ... the perfect realization of Captain Somebody, of the Royal British Navy, in danger of being beset by savages, and resolved to sell his life at a great price ...... When I think of it, the pricture always rises in my mind of a summer evening, the boys at play in the churchyard, and I sitting on my bed, reading as if for life.

Every barn in the neighbourhood, every stone in the church, and every foot of the churchyard, had some association of its own, in my mind, connected with these books, and stood for some locality made famous in them. I have seen Tom Pipes go climbing up the church steeple; I have watched Strap, with the knapsack on his back, stopping to rest himself upon the wicket-gate; and I know that Commodre Trunnion held that club with Mr. Pickle in the parlour of our little village alehouse".

8۔ Stephen Wall (ed) "Charles Dickens", P.38, Penguin Critical Anthologies, 1970.

James Lament, the relative who had lived with us in Bayham Street, seeing how I was employed from day to day, and knowing what our domestic circumstances then were, proposed that I should go into the blacking warehouse, to be as useful as I could, at a salary, I think, of six shillings a week I am not clear whether it was six or seven. I am inclined to believe, from my uncertainty on this head, that it was six at first, and seven ofterwards. At any rate, the offer was accepted very willingly by my father and mother, and on a Monday morning I went down to the blacking warehouse to begin my business life.

It is wonderful to me how I could have been so easily cast away at such an age. It is wonderful to me that, even after my descent into the poor little drudge I had been since we came to London, no one had compassion enough on me ____ a child of singular abilities: quick, eager, delicate, and soon hurt, bodily or mentally ____ to suggest that something might have been, spared, as certainly it might have been, to place me at any common school. Our friends, I take it, were tired out."

9۔ Stephen Wall (ed) "Charles Dickens", P.39.

"No words can express the secret agony of my soul as I sunk into this companionship; compared these everyday associates with those of my happier childhood; and felt my early hopes of growing up to be a learned and distinguished man crushed in my breast. The deep remembrance of the sense I had of being utterly neglected and hopeless; of the shame I felt in my position; of the misery it was to my young heart to believe that, day by day, what I have learned, and thought, and delighted in, and raised my fancy and my emulation up by, was passing away from me, never to be brought back any more, cannot be written".

10۔ Martin Fido, "Profiles in Literature", P.3.

While he was working on the fringes of the law Dickens fell in love for the first time. Maria Beadnell was the daughter of a banker who refused to let her become entangled with a penniless young clerk. Adversity combined with Dickens' passionate and idealistic temperament to give the affair a profound significance for him".

11۔ Study Aides Notes on Dickens' Hard Times, P.3. Methuen Paper backs LTD, 1977.

Martin Fido "Profiles in Literature", P.4. -12

In 1834 Dickens adopted the pen name Boz ...... and began, writing short humorous 'Sketches' for various journals".

Study _ Aids Notes on Dickens' Hard Times, P.3. -13

Dickens Pickwick Papers Notes, P.7. -14

"The Pickwick Papers got off to a slow start, but with the introduction of Sam Weller its sales skyrocketed into the tens of thousands. A Pickwick rage started and Dickens' Success was assured. On the surface this novel is a series of sketches, loosely held together by the adventures of Samuel Pickwick and his friends. Yet there are certain basic themes that unify the novel".

Stephen wall (ed)"Charles Dickens", P.96. -15

I hold my inventive capacity on the stern condition that it must master my whole life, often have complete possession of me, makes its own demands upon me, and sometimes for months together put everything else away from me ...... Whoever is devoted to an Art must be content to deliver himself wholly up to it, and to find his recompense in it."

-16 Dickens Pickwick Papers Notes, P.7.

"Dickens, at twenty-four, married Catherine Hogarth, the daughter of a newspaper colleague. The marriage was genuinely happy at first and there were ten children. Catherine seems to have been a gentle, loving woman, but rather commonplace and lethargic, without much aptitude for house keeping or child-rearing. Under the strain of personality conflicts, the steady pressure of Dickens' numerous activities, and his infatuation with Ellen Ternan, the couple separated twenty-two years later in disagreeable circumstances."

-17 Martin Fido "Profiles in Literature", P.7.

"It was for the first time publicly suggested that Ellen Ternan, the young actress with whom Dickens had been infatuated at the time when he separated from his wife, had in fact subsequently become his mistress. The exact nature of their relationship is still in dispute."

-18 Cliff's Notes on Dickens' Hard Times, P.6, C.K. Hillegass U.S.A, 1964.

-19 Study_ Aids Notes on Dickens' Hard Times, P.5.

Dickens Pickwick Papers Notes, P.11. -20

"He wrote much else besides: Volumes of excellent journalistic essays, two travel books, several hundred letters, a book of Christmas stories, a child's history of England. He also edited three magazines, two of these for many years.

Furthermore, Dickens was very much involved in theater work during the whole of his career. He frequented the theater and, for a time, considered becoming a professional actor. He wrote plays, acted in amateur productions (which were really quite skilled), and he directed plays with an impressive energy and thoroughness".

Cliffs Notes on Dickens' Hard Times, PP. 8،9،10. -21

"Studies of the working and living conditions in England between 1800 and 1834 showed that 82 percent of the workers in the mills were between the ages of eleven and eighteen. Many of these studies proved that 62 percent of the workers in the fabric mills had tuberculosis. The factories were open, barnlike structures, not equipped with any system of heat and ventelation.

These studies, presented to parliament, resulted in some attempt to bring about reforms in working conditions and to alleviate some of the dire poverty in England. In 1802 the Health Act was passed to provide two hours of instruction for all apprentices. In 1819 a child labour law was enacted which limited to eleven hours a day the working hours of children five to eleven years of age; however; this law was not enforced ...... In 1833 the Emancipation Bill ended slavery in British colonies...... Even though chattel slavery was abolished, industrial slavery continued. Also in 1833 came the first important factory law, one which prohibited the employment of children under the age of nine. Under this law children between the ages of nine and thirteen could not work for more than nine hours a day. Night work was prohibited for persons under twenty one years of age and for all women ...... The Poor Law of 1834 provided for workhouses ...... bitterly recented this law, which compelled them to live with their families in workhouses.In fact, the living conditions were so bad that these workhouses were named the "Bastilles of the Poor". Here the poor people, dependent upon the government dole, were subjected to the inhuman treatment of cruel supervisors; an example is Mr. Bumble in Dickens' Oliver Twist. If the people rejected this rule of body and soul, they had two alternatives ...... either steal or starve. Conditions in prisons were even more deplorable than in the workhouses. Debtors' prison, as revealed in Dickens' David Copperfield, was a penalty worse than death."

Philip Collins "Dickens and Crime", P.6, Macmillan and Co. LTD. -22
New York, 1965.

"Few prisons of the first three decades of the century could even boast of much cleanliness, ventilation of drainage ...... a prisoner's fate depended largely on the luck of where he was committed, how strong was his arm, and how deep his purse. Many gaolers and turnkeys were open to bribery; they sold various privileges, sometimes connived at escapes, and regularly trafficked at great profit in the large stores of illicit goods entering their prisons. Male and female prisoners were often in the same prison, sometimes in the same building or room, and the officials did not always strive to promote properiety."

23۔ Ivor Brown "Dickens in His Time", P.10,11.

"William Blake, a poet and a mystic of the same period, was also ready to have his eye on the framework of society. He said that he saw angels in his London garden; he also saw the Devil at work in the 'dark mills' of the new industrial England. He denounced the smoky chaos of factories, slums, and sweated labour which Dickens was to describe in the Black Country wanderings of Little Nell in The Old Curiosity Shop and later in his picture of Mr. Bounderby's Coketown in Hard Times. Blake was also sufficiently a student of politics to realise that dictatorship, whether on the far right or the far left wing of politics, was no remedy but only a corruption of the soul of a nation. He condensed his opinion in two stinging lines:

" The Strongest poison ever known came from Caesar's Laurel Crown."

24۔ رضی عابدی، ''ادب اور سماجی وابستگی'' ص:124، مشمولہ ''تیسری دنیا کا ادب''، لاہور، مکتبہ فکر و دانش، س ن۔

25۔ گلزار جاوید ''براہ راست'' ص13، مشمولہ ماہنامہ ''چہار سو'' راولپنڈی۔

26۔ ایضاً ص:13، 14۔

27۔ ایضاً ص:14۔

28۔ ایضاً ص:14۔

29۔ مشرف احمد ''شوکت صدیقی کی چوپال میں آمد'' ہفت روزہ ''اخبار خواتین'' کراچی، 31 اپریل 1984ء۔

30۔ محسن بھوپالی ''شوکت صدیقی کے اعزاز میں محفل'' روزنامہ جنگ، 13 اپریل 1984ء۔

31۔ انوار احمد، ڈاکٹر ''اردو مختصر افسانہ اپنے سیاسی و سماجی تناظر میں'' (غیر مطبوعہ) ص 378، مملوکہ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، 1983۔

32۔ نجم الاسلام، ڈاکٹر ''پاکستانی ادب اور پاکستان'' مشمولہ ''ادبی جائزے پانچویں کل پاکستان اہلِ قلم کانفرنس کے مقالات''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1986ء۔

33۔ وکیل انجم، ''سیاست کے فرعون'' ص: 15، لاہور، فیروز سنز، 1992ء۔

34۔ شوکت صدیقی ''طبقاتی جدوجہد اور بنیاد پرستی'' ص 106، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1988۔

25۔ رضی عابدی، ''تیسری دنیا کا ادب'' صفحات:207، لاہور، مکتبہ فکر و دانش، س ن۔

26۔ شوکت صدیقی، ''طبقاتی جدوجہد اور بنیاد پرستی'' صفحات:240، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1988ء۔

27۔ عارف ثاقب، ڈاکٹر ''بیسویں صدی کا ادبی طرزِ احساس'' صفحات:168، لاہور، اظہار سنز پرنٹرز، 1999ء۔

28۔ وکیل انجم، ''سیاست کے فرعون'' صفحات:469، لاہور، فیروز سنز، 1992ء۔

(د) تحقیقی و تنقیدی کتب (انگریزی):

29- Cliff's Notes,"Dickens Pickwick Papers Notes"Pages: 97, C.K.Hillegas, 1970.

30- Cliff's Notes "Dickens Hard Times" Pages: 45, C.K. Hillegass, 1964

31- Dyson.A.E.,(ed) "Dickens Modern Judgements" Pages: 288, Macmillan & Co. Ltd. 1968.

32- Forster.E.M, "Aspects of Novel", Penguin Books, 1968

33- Humphry House,"The Dickens World" Pages: 232, Thomas Nelson and Sons,1971.

34- Harvey Peter Sucksmith, "The Narrative Art of Charles Dicknes" Pages: 374, Oxford, Clarendon Press, 1970.

35- Ivor Brown, "Dickens In His Time" Pages: 248, Thomas Nelson Ltd,1965.

36- Ifor Evans,Sir,"A Short History of English Literature" Pages: 287, Penguin Books, 1963.

37- Martin Fido, "Profiles in Literature" Pages: 119, Routlege and Kegen Paul, 1968.

باب دوم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی

باب دوم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی

معاشرتی ناول نگار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو زندگی کی ہو بہو عکاسی کرتے ہیں۔ ایسے ناول نگار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زندگی کی تصویر کشی (Portrayal of Life) کرتے ہیں اس کے برعکس بعض ناول نگار زندگی کو دکھانے کے ساتھ ساتھ اس پر تنقید (Criticism) بھی کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو ناانصافیوں اور دکھوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنے ناولوں میں مثالی اور تصوراتی دنیا (Utopiac World) تخلیق کرتے ہیں، جس کا وجود حقیقی زندگی میں مفقود نظر آتا ہے، زندگی میں تبدیلی لانے والے ناول نگار کو انقلابی ادیب کہا جاتا ہے یعنی ایک ایسا ادیب جو معاشرے میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہو۔ وہ ظلم و جبر کے خلاف نظریاتی اور عملی طور پر برسرِ پیکار نظر آتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا شمار اسی دوسری قسم کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں ناول نگار طبقاتی تقسیم ناانصافیوں اور ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں۔

چارلس ڈکنز نے اپنے دور کے انگلستان کی عکاسی کرتے ہوئے صنعت کار کو غربا کے استحصال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سے بہت زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ مگر انہیں قلیل معاوضہ ملتا تھا۔ ان کے لیے تفریح کے اوقات اور مواقع نہیں تھے۔ کارخانوں میں مناسب ہوا اور روشنی کا بندوبست بھی نہیں تھا۔ مزدور مہلک بیماریوں کا شکار ہو جاتے تو ان کی مدد نہ کی جاتی۔

غریب بچے کسی تحفظ کے بغیر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے خود چارلس ڈکنز کو اپنے بچپن کا کچھ حصہ ایک کارخانے میں مزدور بچے کے طور پر کام کرنا پڑا۔ بچپن کی تلخیاں اسے عمر بھر یاد رہیں۔ اس زمانے کی تلخیوں نے ڈکنز کے دماغ کو مستقل طور پر مجروح کر دیا۔ اور بچپن کے دکھوں اور محرومیوں کے ضمن میں اسے بڑا ناول نگار بنا دیا۔ وہ اکثر بچپن کے بھیانک خوابوں میں گم ہو جاتا تھا اور واپس زندگی کے ابتدائی ادوار

میں مایوسیوں اور تاریکیوں کی پرچھائیوں میں چلا جاتا تھا۔ ان کا ذکر اس نے مختلف ناولوں میں کیا ہے۔ Pip، David Copperfield، Oliver Twist، Little Nell اور Paul Dombey ننھے بچوں کی صورت میں ایسے کردار ہیں جنہیں نامساعد حالات کی سختیاں جھیلنا پڑیں۔ انسان اپنے اندر اور باہر مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہے۔ اس کشمکش کی عکاسی ڈکنز کے ادبیانہ فن میں بخوبی کی گئی ہے بیرونی عوامل کو مختلف کرداروں کی تشکیل کا سبب دکھایا گیا ہے۔ زیردستوں کو کچلنے والی ہولناک قوت کی کئی صورتیں ہیں مثلاً سرمایہ دار، یتیم خانے کی انتظامیہ، سوتیلا باپ اور صنعت کار، قوت اندھی ہوتی ہے اور با اختیار شخص کو ظالم بنا دیتی ہے۔ ڈکنز نے دل کی تاریکیوں کو ہر ممکنہ رنگ (Shade) میں دکھایا ہے۔ اس ضمن میں Miss.Havisham، Compeyson، Mr.Bumble اور Mr.Murdstone نمائندہ کردار ہیں۔

Sir Ifor Evans اپنی کتاب "A Short History of English Literature" میں لکھتے ہیں کہ ڈکنز اپنے عہد کے سوشل سسٹم سے نفرت کرتا تھا۔ ایسی بہت سی Indications ہیں جو کافی حد تک اسے انقلابی ظاہر کرتی ہیں۔ (1) مزاح اس کا وصف تھا لیکن غم و اندوہ اس کے فن پر چھانے لگے اور اس نے اپنے فن کے ذریعہ سخت دل نسل انسانی کو انسانیت کا پیغام پہنچایا۔ "A Christmas Carol" میں انسانی ہمدردی وجدان کی رفعتوں تک پہنچ گئی ہے۔ ڈکنز ٹھنڈی روشنی کی مانند تھا جس نے انسانوں کو ہنسی خوشی اور ہمدردی کی طرف بلایا اور ظلمات کو مٹانے کی کوشش کی جس میں وہ اپنے آپ کو پھنسا رہے تھے۔ ناول Hard Times (1854ء) میں ڈکنز نے ایسے سرمایہ دارانہ نظام پر طنز کیا ہے جس کی بنیاد خود غرضی پر ہے۔ اس ناول کے ایک کردار Thomas Gradgrind کو "Mr.Utilitarian" کہا گیا ہے۔ وہ حقائق پسند ہے اور نفع و نقصان کا خیال رکھنے والا ہے۔ اور اس اصول پر کاربند ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں اس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ ناول Little Dorrit (1855-77ء) میں مقروضوں کے قید خانے کی خراب حالت بیان کی گئی ہے۔

ڈکنز نے "Bleak House" (1853ء) میں عہد وکٹوریہ (1837-1901ء) کی ناانصافیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ اس عہد کے قوانین اور معاشرے پر طنز کرتا ہے۔ اس ناول کا کردار Deadlock (بند قفل) نام ہی بذاتِ خود ایسا ہے جو معاشرتی جھگڑے (Conflict) میں اُلجھے ہوئے Sir Leicester کے

دوستوں کے لیے سدّ گلی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی بند قفل ذات کے نظام، پارلیمنٹ، معاشی نظام اور دقیانوسی مذہب میں ہیر پھیر کا ماخذ ہے "Bleak House" (1853ء) میں انگلینڈ کی معاشرتی ساخت میں خرابیوں کی وجہ پارلیمنٹ کا نظام، عدالتیں، چرچ اور جاگیرداروں کی حویلیاں ہیں۔ ناول "Martin Chuzzlewit" (1843-44) میں طنز انگریزی اور امریکی زندگی پر ہے۔ ڈکنز طنز کو بار بار دہراتا ہے تاکہ ناسمجھ قاری بھی اس کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکے۔ ناول "Oliver Twist" سماجی اور اخلاقی برائیوں (جس میں جبری مشقت اور جرائم پیشہ افراد شامل ہیں) کے متعلق ہے۔ ناول "Nicholas Nickleby" (1838-39ء) میں یارک شائر سکولوں (Dothboys Hall) میں بچوں پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کی گئی ہے "Old Curiosity Shop" (1840-41ء) میں Little Nell کی موت اسی خیال (Theme) کو آگے بڑھاتی ہے۔ ناول "A Tale of Two Cities" (1859ء) بڑے پیمانے پر ہونے والی انسانی تذلیل کی عکاسی کرتا ہے۔

"The Dickens World" میں Humphry House نے "History Text Book" میں سے اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ ڈکنز بطور

> ''عظیم ناول نگار، اپنے دور کے دیگر ناول نگاروں کی طرح ایک مصلح تھا۔ اس کی کہانیاں خواہ اندوہناک ہوں یا مزاحیہ اس کے زمانے کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی برائیوں (Abuses) کے خلاف احتجاج ہیں۔'' (2)

Humphry House آگے چل کر اپنے خیال کا اظہار یوں کرتا ہے۔

> ''ڈکنز کی تاریخ، ڈکنز کی اصلاح سے الگ نہیں۔ ڈکنز ماضی کی برائیوں کو بے نقاب کرنے سے خود دلچسپ اور جاذب توجہ بن گیا۔ ایسا کرنے میں کرسمس کی Harmony سی آ گئی ہے مقروضوں کو اب قید نہیں کیا جاتا۔ قرض دینے والوں کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے اور Parish-boy جو زیادہ خوراک کا تقاضا کرتا ہے اس کا طبی معائنہ کلینک

میں کرایا جاتا ہے۔ نئے ایام پرانے ایام سے کافی بہتر ہیں اور ڈکنز نے
اُنہیں بہتر بنانے میں مدد دی ہے''۔(3)

شوکت صدیقی نے بھی اپنے عہد کے مختلف پہلوؤں کو کچھ ایسے انداز سے دکھایا ہے کہ ادبی رنگ میں معاشرتی برائیاں منظرِ عام پر آگئی ہیں تاکہ ان کا قلع قمع کیا جائے اور معاشرے کی اصلاح ہو۔ چنانچہ شوکت صدیقی نے زندگی کی روش پر تنقید کی ہے۔ اُنہوں نے زمینداروں کے عقوبت خانوں سے پردہ ہٹا کر دکھایا ہے کہ ان کے اندر کیسے مظالم ہو رہے ہیں۔ معتوب مردوں، عورتوں اور بچوں کو کربناک سزائیں دی جارہی ہیں۔ اُنہیں کن کن حربوں سے تکلیف پہنچائی جارہی ہے کسی مظلوم سے کوئی معمولی سی غلطی سرزد ہوئی ہے تو اسے کتنی بڑی سزا دی گئی ہے۔ ظلم کا شکار ہونے والوں کو بھوکا، پیاسا رکھا جاتا ہے ان کی برداشت سے بڑھ کر ان سے مشقت کرائی جاتی ہے۔ ان کی حالتِ زار یہ ہوتی ہے کہ وہ مرتے ہیں نہ جیتے ہیں۔ بس دکھ پہ دکھ جھیلتے چلے جاتے ہیں اور اُن کی گردن قید با مشقت کے جوئے میں محبوس رہتی ہے۔ انسانیت کراہتی، چیختی، چلاتی، آہیں بھرتی اور سسکیاں لے رہی ہے۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں۔

> ''شوکت صدیقی نے معاشرے کے تلخ پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ حسن و خیر، روشنی اور اجالے کی علم برداری کرنے والے تو بہت ہیں لیکن ظلمت، تاریکی اور بدصورتی کو گلے لگانے والے چند لوگ ہوتے ہیں، چمکتی چھلکتی چیزوں کو پیش کر کے ناظر کی آنکھوں کو خیرہ کرنا کمال نہیں، فنکاری تو یہ ہے کہ گری پڑی چیزوں کو حسنِ لازوال بخش دیا جائے۔''(4)

شوکت صدیقی نے اپنے ناولوں میں دکھایا ہے کہ امرا کس طرح بنی نوعِ انسانی کا استحصال کر رہے ہیں۔ دکھ ہیں محرومیاں ہیں۔ افلاس کے اندھیرے ہیں۔ امید افزا روشنی کہیں نہیں ہے۔ دولت مندوں کے دل سخت ہیں۔ دولت نے اُنہیں پتھر بنا دیا ہے۔ انسانی ہمدردی مفقود ہے۔ زمیندار مزارعوں کو زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔ ان پر ہر قسم کا حکم چلانا زمینداروں کا حق ہے۔ آزاد اور خود مختار زندگی گزارنا محنت کش اور مزدور کا حق نہیں وہ تو بس اُمراء کی خدمت کے لیے زندہ ہے مگر اپنی خاطر اس کی کوئی زندگی نہیں۔ غریب خواتین کا

معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ وہ دولت مندوں کے گھروں میں ''رکھیل'' کے طور پر رکھی جاتی ہیں اور ذلت کی زندگی گزار رہی ہیں۔

لاوارث بچوں کی حالتِ زار قاری کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ ورکشاپوں میں معصوم بچے سارا دن کام کرتے ہیں۔ بچپن زندگی کا سنہرا دور ہوتا ہے۔ مگر ورکشاپوں میں کام کرنے والے بچوں کے لیے یہ زمانہ ڈراؤنا خواب بن گیا ہے۔ بچپن تو کھیل کود، خوشیوں اور پڑھنے لکھنے کا دور ہوتا ہے مگر ورکشاپوں میں کام کرنے والے بچوں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے لیے گیند ہے اور نہ پڑھنے کے لیے کتاب۔ اس کے برعکس ان کے سیاہی سے اَٹے ہاتھوں میں لوہے کے اوزار ہیں اور وہ میلے چیتھڑوں میں ملبوس ہیں۔ لاوارث بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ان کے لیے گمراہی کے تمام راستے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ آوارگی محتاجی اور محرومی کی علامت بنے پھرتے ہیں۔ لاعلم بچہ نشہ کرنے، چوری کرنے، جیب کترنے، دھوکہ دہی جیسے جرائم کا مرتکب ہو جاتا ہے اور عادی مجرم بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف ناول ''خدا کی بستی'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''یہ تو ایسا عالم ہے جس میں ہماری اپنی زندگی کی پوری دھڑکن موجود ہے۔ معاشرے کی ناہمواریاں، بلیک مارکیٹ، گداگری، یتیم خانے کی خرابیاں، بیکاری، جیب کترے، تعلیمی مسائل، مذہب کی آڑ میں استحصال، سول افسروں کی دھاندلی، رشوت ستانی، میونسپلٹی کے نقائص، خانقاہوں کی حالتیں، امرد پرستی غرض وہ سب کچھ ہمیں دکھائی دیتا ہے جو ہماری اپنی زندگی، ہمارے اپنے معاشرے میں عام ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ ہماری ہی زندگی کا عکس ہے۔ وہ زندگی جس سے ہم بیزار ہیں۔ جس سے ہم آنکھیں چار نہیں کر سکتے۔ لیکن ناول میں ہماری ہی زندگی ہمارے سامنے ہوتی ہے اور ہم اس میں کھو جاتے ہیں، اس میں پوری طرح دلچسپی لیتے ہیں اور یہ اس فنکار کا کمال ہے جس نے زندگی کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے۔ بے نقاب کر کے اسے محسوس کرایا ہے۔ جن پہلوؤں کو ہم قابلِ نفرت سمجھ کر ٹھکرا دیتے ہیں۔ آگے بڑھ جاتے

ہیں آج ایک فن کار نے ان کو اہم بنا کر ہمیں اس میں محو کر دیا ہے۔'' (5)

شوکت صدیقی کا مشاہدہ ہے کہ معاشرے کی بھیانک حالت کا ذمہ دار سرمایہ داری نظام ہے۔

''پاکستان کے معروضی حالات میں تو تمام سیاسی اور اقتصادی برائیوں کی جڑ جاگیرداری نظام ہے۔'' (6)

سرمایہ داروں کے دل اور دماغ خالی ہیں۔ ان میں بصارت ہونے کے باوجود بصیرت مفقود ہے۔ انہیں نظر نہیں آتا کہ ان کے سامنے انسانیت تڑپ رہی ہے۔ لیوٹالسائی نے اپنے ایک افسانے "The Imp and peasant's Bread" میں وضاحت کی ہے کہ دولت کی فراوانی سے انسان کے اندر لومڑی کے خون، بھیڑیے کے خون اور سور کے خون کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی نے اپنے اپنے دور کی حالت زار پیش کی ہے۔ دونوں نے امرا کے مظالم منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ دونوں کے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

ڈکنز کے ناول معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافیوں کو ختم کرنے کے لیے عمل پر اکساتے ہیں۔ وہ انجماد اور بے عملی کو جھٹلاتا ہے۔ غربت کے مارے دکھی انسان ڈکنز کے ناولوں کا بنیادی موضوع ہیں۔ ناول "A Tale of Two Cities" (1859ء) میں ڈکنز ماضی پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ایسا اس لیے نہیں کرتا کہ ماضی میں رہ کر حال کو فراموش کر دیا جائے بلکہ وہ ماضی سے سیکھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس ناول کے پہلے پیراگراف میں وہ لکھتا ہے۔

''یہ بہترین دور تھا، یہ بدترین دور تھا، یہ عقل مندی کا دور تھا، یہ بیوقوفی کا دور تھا...... یہ روشنی کا دور تھا، یہ اندھیرے کا دور تھا، یہ اُمیدوں کی بہار کا دور تھا، یہ مایوسی کی انتہا کا دور تھا...... مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دور آج کے دور کی طرح تھا۔'' (7)

(P-13)

ڈکنز اس ناول میں ادنیٰ طبقے کی طرف سے اعلیٰ طبقے کی بے حسی اور ظلم و جبر کو انقلاب کا پیش خیمہ بتاتا ہے۔ ناول "A Tale of Two Cities" (1859ء) انقلاب فرانس کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

غریبوں کی حالتِ زار واشگاف الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔فرانس میں اُمراءغریبوں کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔اس طبقے نے زمین پر اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ رکھے تھے۔وہ اس بات پر اندھا دھند کاربند تھے کہ دنیا صرف ان کی خوشی کے لیے بنائی گئی ہے۔زیادہ سے زیادہ خوشیوں کے حصول کے لیے وہ غریبوں کو معاوضہ کے بغیر کام کرنے پر مجبور کر دیتے۔دوسرے الفاظ میں غریب عوام اپنے آقاؤں کی زرخرید غلام تھی۔امرا کے شر سے غریب خواتین کی عزت بھی محفوظ نہ تھی۔صرف خوشیوں کا حصول ہی ان کا مقصدِ حیات تھا۔

غریب اس قدر تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ بھوک اور پیاس کو مٹانے کے لیے ان میں اچھی اور بری چیز میں تمیز نہ رہی تھی۔St.Antoine کے علاقے میں Defarge کی دکان کے سامنے شراب کا ایک بڑا ڈرم گاڑی سے گر کر ٹوٹ گیا۔اس میں سے شراب بہنے لگی۔اس علاقے کے بہت سے لوگ بڑے شوق سے اسے پینے کے لیے دوڑے۔زمین پر بہتی ہوئی شراب جس میں مٹی کی آمیزش تھی ان کے لیے آبِ حیات کا درجہ رکھتی تھی۔شراب ختم ہونے کے بعد لوگوں پر پہلے کی طرح مایوسی چھا گئی انہی لوگوں میں سے ایک شخص "Gaspard" نے اپنے اندرونی جذبات کے اظہار کے لیے دیوار پر شراب سے لفظ ''خون'' لکھ دیا۔

"Scrawled upon a wall with his finger
dipped in a muddy wine - lees - BLOOD" (8)
(P-38)

یہ الفاظ اس بات کا اظہار تھا کہ غریب عوام امرا کے خلاف کس قدر انتقام کا جذبہ سموئے ہوئے تھے۔

اُمرا ہر وقت زرق برق لباسوں میں ملبوس رہتے تھے۔ان کے لیے ظاہری شان وشوکت ہی بڑی چیز تھی۔اس دور کے امراء کی نمائندہ مثال Marquis St.Evermond ہے۔ایک چھوٹا غریب بچہ اس کی بگھی کے نیچے آکر مر جاتا ہے۔Marquis بڑی شان بے نیازی کے ساتھ بچے کے مظلوم باپ (Gaspard) کی طرف سونے کا سکہ اُچھال دیتا ہے۔جسے بچے کا باپ "Gaspard" واپس بگھی میں پھینک دیتا ہے۔

''اُس نے اپنا پرس باہر نکالا اور کہا ''یہ میرے لیے غیر معمولی
ہے۔تم لوگ اپنا اور اپنے بچوں کا خیال نہیں رکھ سکتے۔تم میں سے کوئی نہ

کوئی ہمیشہ راستے کی رکاوٹ بنتا ہے۔ مجھے اس بات کا کیسے پتہ چلے گا کہ میرے گھوڑوں کو تم نے کیا نقصان پہنچایا ہے۔ دیکھو! یہ اسے دے دو''۔

اس نے سونے کا ایک سکہ نیچے گرایا۔ لوگوں کے سر آگے کی طرف جھکے تا کہ ان کی آنکھیں اسے گرتے ہوئے دیکھ سکیں۔ لمبے آدمی نے اپنی غیر مرئی آواز میں دوبارہ آہ وزاری کی اور کہا ''یہ مرا ہوا ہے''۔

لمبا آدمی ایک اور آدمی کی طرف متوجہ ہوا، جس کے لیے لوگوں نے راستہ بنا دیا تھا۔ قابلِ رحم مخلوق (لمبا آدمی) روتے اور چیختے ہوئے کاندھے کے بل گرا اور فوارے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں کچھ عورتیں بے حس وحرکت (ڈھیر) پر جھکی ہوئی تھیں۔ تاہم وہ بھی مردوں کی طرف خاموش تھیں۔

''میں تمام واقعہ جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں''۔ آنے والے آدمی نے کہا ''میرے گاسپرڈ! بہادری کا مظاہرہ کرو۔ چھوٹے بچے کے لیے اس طرح مر جانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ یہ ایک لمحے میں بغیر کسی تکلیف کے مر گیا ہے۔ کیا وہ صرف ایک گھنٹہ بھی خوشی کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا''؟

موسیو مارکیز نے ہجوم کی طرف دوسری مرتبہ دیکھنا تک گوارا نہ کیا اور اپنی گدی پر دراز ہو گیا۔ وہ ایک ایسے معزز شخص کی طرح جس نے کسی معمولی چیز کو حادثاتی طور پر توڑ دیا ہو اور اس کی قیمت بھی ادا کر دی ہو اور اس کی قیمت ادا کرنے کے قابل بھی ہو، روانہ ہونے کے قریب تھا۔ کہ ایک سکہ کھنکھناتا ہوا اس کی بگھی کے فرش پر گر کر بجنے لگا۔

موسیو مارکیز نے کہا ''رکو! گھوڑوں کو روک دو۔ اسے کس نے پھینکا ہے؟''

اس نے اس جگہ دیکھا جہاں ایک لمحہ پہلے شراب فروش Defage موجود تھا لیکن اس جگہ بچے کا مظلوم باپ فٹ پاتھ پر منہ کے بل جھکا ہوا تھا اور اس کے پیچھے ایک مضبوط سیاہ فام عورت کچھ بُن رہی تھی۔ ''تم کتو!'' مارکیز نے اپنے چہرے کو بگاڑے بغیر پرسکون انداز میں کہا۔
''میں بخوشی تم میں سے کسی پر بگھی چڑھا سکتا ہوں اور صفحۂ ہستی سے اسے مٹا سکتا ہوں۔ اگر مجھے پتہ چل جائے کہ کس بدبخت نے اسے بگھی میں پھینکا ہے اور اگر وہ ڈاکو بگھی کے نزدیک ہے تو اسے پہیوں کے نیچے کچل دیا جائے گا۔''(9)

(P-116-117)

بچے کا باپ ''Gaspard'' مارکیز کی بگھی کا پیچھا کرتا ہے اور رات کے وقت اسے قتل کر دیتا ہے۔ Gaspard کو سزائے موت دے دی جاتی ہے۔

فرانس میں عدل وانصاف کا نام ونشان نہ تھا کسی کو امرا کے کردار پر انگلی اُٹھانے کی جرأت نہ تھی۔ Dr.Mennite کو ایک قتل کی طبی رپورٹ حسب منشا نہ لکھنے پر Bastille (قید خانے کا نام) میں اٹھارہ سال قید رہنا پڑا۔

غریب جو بڑی مدت سے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے ان میں اس ماحول سے آزادی کے لیے تڑپ پیدا ہوئی۔ اور وہ دبے دبے لفظوں میں امرا کے خلاف احتجاج کرنے لگے۔ ظلم کے خلاف برسرِ پیکار ہونے کے آثار نظر آرہے تھے۔ گورنمنٹ اس صورتحال سے باخبر تھی۔ اس مقصد کے لیے جاسوس مقرر کئے گئے تا کہ انقلاب کی لہر کو سر اُٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا جائے لیکن سازشی بڑے محتاط تھے۔ البتہ اُمرا انہیں سمجھتے تھے کہ وہ نظام جس کے تحت وہ غریبوں کا استحصال کر رہے ہیں بہت جلد زبردست قوت سے ملیا میٹ ہو جائے گا اور یوں وہ انقلابیوں کے سامنے قطعی طور پر بے بس ہو جائیں گے۔

اچانک فرانس میں انقلاب آ گیا۔ St.Antoine میں شراب خانے کے سامنے بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ سب اسلحہ سے لیس تھے اور پورے جوش وخروش کے ساتھ ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔

Defarge اس ہجوم کا رہنما تھا۔ ہجوم نے Bastille کے قید خانے کا رخ کیا۔ جہاں بے گناہوں کو قید میں رکھا جاتا تھا۔ ہجوم نے Bastille کا محاصرہ کر لیا اور اس پر حملہ آور ہو گئے گورنر نے اس قید خانے کے دفاع کے لیے پورا زور لگایا بالآخر وہ بے بس ہو گیا چنانچہ قید خانے کے دروازے کھول دیئے گئے ہجوم اندر داخل ہو گیا افسروں کو پکڑ لیا گیا۔ بہت سے افراد کو موقع پر قتل کر دیا گیا لوگوں کا خون انتقام کی آگ میں کھول رہا تھا۔ امرا کو گھروں سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور انہیں رسوں سے جکڑ کر پھانسی دے دی گئی ڈکنز نے Bastille پر طوفانی حملے کو سمندر سے تشبیہہ دی ہے۔

> ''ایک گرج کی آواز آئی جیسے فرانس میں تمام سانس (All the breath) نے ایک نفرت بھرے لفظ کی صورت اختیار کر لی ہو۔ زندہ سمندر اچھل پڑا۔ لہر پر لہر، گہرائی پر گہرائی تک شہر ڈوب گیا۔ خطرے کی بجتی ہوئی گھنٹیاں، پٹتے ہوئے ڈھول، اپنے نئے ساحل پر تلاطم میں بپھرا ہوا سمندر، حملہ شروع ہو گیا۔''(10)
>
> (P-214)

اس تخیلاتی منظر میں انقلابِ فرانس کی کچھ خصوصیات مثلاً ظلم اور تباہی سمندر کے ساتھ مشترک نظر آتی ہیں۔ انقلابِ فرانس کے دوران پیرس کے ساتھ جو کچھ بیتی موجودہ دور کے کسی شخص نے اپنی آنکھوں سے یہ قومی طغیان نہیں دیکھا۔ لیکن ان میں سے اکثر نے کسی نہ کسی وقت سمندر کو گرج اور شور کی جولانیوں میں طوفان برپا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور یوں مصنف نے ''سمندر'' کو ''انقلاب فرانس'' سے تشبیہہ دے کر پیرس کے اس وقت کے مناظر اور واقعات کو قاری کے تصور میں اُجاگر کیا ہے۔

ڈکنز کا ناول "Hard Times" (1854ء) انسانی تشدد کی المیہ کہانی ہے۔ یہ ناول "Coketown" کے علاقے کی عکاسی کرتا ہے۔ جو سرخ اینٹوں سے بنا ہوا صنعتی شہر ہے۔ اس کے سکولوں اور فیکٹریوں میں بچوں اور بالغوں کو پنجروں میں بند کر دیا جاتا ہے جن کی کوئی ذاتی آزادی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ان کی روحیں مجروح ہو جاتی ہیں۔ اس سیاسی پس ماندگی میں جہاں ظالم حکومتیں لاگو کی جاتی ہیں (جیسے Josiah Bounderby نے کی) وہاں ناول میں نئی مشینی سوسائٹی کے اس اندوہ ناک پہلو کو بھی

دکھایا گیا ہے جہاں انسان کو مشین سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ صنعت کار طبقہ غریبوں کو کس طرح کچلتا ہے اس کا اظہار یونین کے ایک کردار کے ذریعہ یوں کیا گیا ہے۔

''اے میرے دوستو! Coketown کے کچلے ہوئے لوگو!
میرے دوستو اور ساتھی ہم وطنو! ظلم کے آہنی پنجے میں پسنے والے غلامو!
اے میرے دوستو اور دکھ میں تکلیف اُٹھانے والے میرے ساتھیو!
میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وقت آ گیا ہے جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل
کر ایک متحد قوت بن جائیں اور تشدد کرنے والوں کو مٹی میں ملا دیں جو
ہمارے خاندانوں کو لمبے عرصے سے لوٹ رہے ہیں۔'' (11)

(P-123)

صنعتی زندگی سے انسان کا دم گھٹ رہا ہے۔ ہر طرف بوریت اور یکسانیت طاری ہے۔ صنعت کار Josiah Bounderby بے پناہ لالچی انسان ہے۔ Thomas Gradgrind مفاد پرستی کے معاشی نظریہ کی تجسیم نظر آتا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ وہ زندگی کو شماریات کے پیمانے میں تولے۔ وہ صرف اپنے مفاد کو ہی پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کی بیٹی Louisa اس کے مفاد پرستانہ نظریات کا شکار ہو جاتی ہے۔

ڈکنز Coketown کے قصبے کو بیان کر کے صنعتی معاشرے میں بدعنوائیوں کا منظر پیش کرتا ہے۔ وہ اس قصبے کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''یہ سرخ اینٹوں سے بنا ہوا تھا...... لیکن موجودہ صورتحال میں یہ
ایک وحشی کے پینٹ شدہ چہرے سے مشابہ نظر آتا تھا۔ اس قصبے میں مشینیں
اور اونچی چمنیاں تھیں جن میں سے دھواں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا نکل
رہا تھا اور اس کے یہ پیچ و خم کبھی ختم نہیں ہوتے تھے قصبے میں ایک سیاہ رنگ
کی نہر بہتی تھی۔ ارغوانی رنگ کے دریا سے اردگرد کے ماحول میں بدبو پھیل
رہی تھی۔ کثیر تعداد عمارتوں میں بے شمار کھڑکیاں لگی تھیں جن پر کھڑکھڑاہٹ
اور کپکپی کا سماں طاری رہتا اور جہاں سٹیم انجمن کا پسٹن (Piston)

مسلسل حرکت میں رہتا جیسے غمگین ہاتھی کا سر پاگل پن کی حالت میں حرکت کر رہا ہو۔ اس قصبے میں بہت سی ایک جیسی لمبی اور چھوٹی گلیاں تھیں جو ایک دوسرے سے کافی مشابہ تھیں ان گلیوں میں ایک جیسے لوگ بستے تھے جو یکساں اوقات میں باہر نکلتے اور واپس آتے۔ ان راستوں پر ایک جیسی آواز ہوتی۔ کارکنوں کے لیے یکساں کام ہوتا۔ ان کے لیے ہر دن گزرے ہوئے اور آنے والے دن کی طرح ہوتا اور ہر سال پچھلے سال اور آئندہ سال کی طرح ہوتا۔''(12)

(P-19)

ڈکنز نے Coketown کے علاقے کو وحشی کے پینٹ شدہ چہرے سے اور سٹیم انجن کے متحرک پسن کو غمگین ہاتھی کے سر سے تشبیہ دی ہے۔ ڈکنز دراصل ان تشبیہات کے ذریعہ انسانی سفا کی کو ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

ڈکنز Coketown کے ذریعہ شمالی صنعتی قصبوں کے اندوہناک حقائق بیان کرتا ہے جہاں کارکنوں کو مشینوں سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ اس ناول میں آقا اور غلام کے درمیان فرق کو نہایت واضح انداز میں دکھایا گیا ہے۔ ڈکنز نے اس ناول میں مجرد تصورات کے دھوکوں سے باز رکھا ہے۔ اس کے نزدیک لوگ مشینوں سے بڑے ہیں کیونکہ مشینوں کو وہ خود بناتے ہیں۔

ناول "Old Curiosity Shop" (1840-41) میں ایک چھوٹی بچی "Nell" اور اس کے دادا کی دردناک موت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ Nell کا دادا ایک دکان کا مالک ہے لیکن اپنی قسمت بدلنے کے لیے وہ جوا کھیلتا ہے اور ہار جاتا ہے۔ دادا پوتی کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ دونوں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ ایک دن وہ ایک گاؤں کے پاس سے گزرتے ہیں بھوک کے مارے ان کا برا حال ہے اس گاؤں کے لوگ بھی غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں۔ ان پر زندگی اور موت کی کیفیت طاری ہے۔

چلتے چلتے دادا بھوک سے نڈھال ہو کر پوتی سے کھانے کے لیے کچھ مانگتا ہے۔

''دوپہر کے قریب اس کے دادا نے خوراک کا تقاضا کیا۔ وہ بدنصیب جھونپڑوں میں سے ایک کے نزدیک پہنچی اور اپنے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نحیف ونزار آدمی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا ''تم کس مقصد کے تحت یہاں آئی ہو؟''

''خیرات، روٹی کا ایک نوالہ''

آدمی نے زمین پر ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا'' کیا تم یہ دیکھ رہی ہو؟ یہ ایک مرا ہوا بچہ ہے۔ تین ماہ ہوئے مجھے اور میرے ساتھ پانچ سو آدمیوں کو کام سے نکال دیا گیا۔ یہ میرا تیسرا اور آخری مرا ہوا بچہ ہے۔ کیا تم تصور کرسکتی ہو کہ میرے پاس خیرات کے لیے کچھ بچا ہوگا یا خوراک کا کوئی فالتو نوالہ ہوگا؟''

بچی دروازہ سے ہٹ گئی اور دروازہ اس پر بند کر دیا گیا۔ شدید ضرورت کے تحت اس نے دوسرا نزدیکی دروازہ کھٹکھٹایا جو اس کے ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے کھل گیا۔''(13)

(P-314)

معصوم بچی یہاں سے بھی نا اُمید ہو کر واپس پلٹ آئی۔ Andrew Sanders اپنی کتاب "Charles Dickens Resurrectionist" میں لکھتا ہے۔

''Nell اور اس کا دادا ثابت قدمی سے آگے بڑھتے رہے ''انہوں نے کبھی بھی اتنی بے چینی سے صاف ہوا اور کھلے ماحول کی آزادی کی خواہش نہیں کی تھی جتنی وہ اب محسوس کررہے تھے'' ان کا جہنم کی طرح تکلیف دہ سفر دو دنوں اور دو راتوں تک مزید جاری رہا جو اُنہیں سڑک کے کنارے آگے بڑھاتا رہا۔ سڑک کی دونوں اطراف انسانیت کی تذلیل (جو کہ ان لوگوں کے لیے روحانی موت تھی جو اُسے

تسلیم کر چکے تھے) کا نظارہ پیش کر رہی تھیں ۔ بھوکے اور قحط زدہ ہونے
کی وجہ سے اُنہیں خوراک کے لیے بھیک مانگنا پڑتی ہے ۔ بے گھر ہونے
کی وجہ سے وہ گندے جھونپڑوں میں پناہ تلاش کرتے ہیں ۔'' (14)

پے در پے مصائب کا سامنا کرتے ہوئے چھوٹی بچی Nell بالآخر مر جاتی ہے ۔ چھوٹی بچی کی وفات کے کچھ عرصے بعد اس کا دادا بھی پوتی کی قبر پر مردہ حالت میں پایا جاتا ہے ۔ Nell اور اس کے دادا کی وفات ہمیں Cordelia اور King Lear کی موت یاد دلاتی ہے ۔ اگرچہ ڈکنز کے ہاں غم کی لے حقیقی دکھ پر غالب آجاتی ہے اور جذباتیت کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے جبکہ شیکسپیئر Cordelia کی وفات کو بڑے دھیمے انداز میں پیش کرتا ہے ۔ ڈکنز Nell کی موت کو ماتم کرنے والے کی دکھ بھری آہوں کی گونج میں بیان کرتا ہے ۔

ناول "Oliver Twist" (1837-38ء) کا مرکزی خیال بچپن کے غم اور دکھ کے مقابلے میں جرائم پیشہ افراد اور جیب کترے Fagin اور اس کے رفیق جرم Bill Sikes، Dodger اور Nancy کے کرداروں کو اجاگر کرنا ہے ۔ Oliver ایک یتیم بچہ ہے وہ کلیسائی حلقے کے ایک معمولی کارندے Bumble کے ہاں پرورش پاتا ہے ۔ Bumble نہایت جابرانہ فطرت کا مالک ہے ایک دن جب Oliver اپنے معمول کے کھانے کے علاوہ کچھ اور مانگتا ہے تو وہ اسے دھتکار دیتا ہے ۔

"Please, sir, I want some more". (15)

(P-15)

منتظم آلیور کے مزید خوراک طلب کرنے پر اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے وہ اسے مارتا پیٹتا ہے اور انتظامیہ کے پاس جا کر Oliver کی شکایت کرتا ہے ۔

''منتظم نے آلیور کے سر پر چمچ مارا ۔ اس کے بازوؤں کو جکڑ لیا اور
محتاج خانے کے کارندے کو زوردار آواز سے بلایا ۔ جب Mr.Bumble
پُر جوش انداز میں کمرے میں داخل ہوا تو انتظامیہ میٹنگ میں بیٹھی تھی اس
نے انتظامیہ کے سربراہ سے کہا "Mr.Limbkins میں آپ سے

معذرت کا طلب گار ہوں۔ آلیور ٹوئسٹ نے مزید (کھانے کے لیے) طلب کیا ہے'' (میٹنگ میں موجود) ہر شخص چونک پڑا۔ ہر چہرے پر خوف عیاں تھا ''اور زیادہ'' Mr.Limbkins نے کہا۔ ''ہوش کے ناخن لو بمبل اور مجھے واضح طور پر بتاؤ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس نے اپنی مقررہ خوراک سے زیادہ طلب کیا ہے۔'' بمبل نے جواب دیا ''اس نے یہی تقاضا کیا ہے'' سفید کوٹ میں ملبوس سربراہ نے کہا ''اس لڑکے کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔'' (16)

(P-15-16)

اعلیٰ حکام کے حکم سے اُسے اس ٹھکانے سے بھی بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد وہ جرائم پیشہ افراد کے نرغے میں گھر جاتا ہے جس کا سربراہ Fagin ہے۔ Oliver کو جیب کترہ اور چور بنا دیا جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے Oliver ایک رحمدل آدمی Mr.Brownlow کی بروقت امداد کی بدولت بچ جاتا ہے۔ لیکن دوبارہ ان جرائم پیشہ افراد کے پھندے میں پھنس جاتا ہے جو اُسے کڑی سزا دیتے ہیں۔ ناول کے آخر میں یہ مجرم اپنے اعمال کی بدولت دردناک انجام کو پہنچتے ہیں۔ Fagin کو پھانسی دے دی جاتی ہے اور Bill Sikes خودکشی کر لیتا ہے۔ بالآخر Oliver Twist اچھی قسمت کی طرف پلٹتا ہے۔ اس کے نجات دہندہ کی بیٹی Rose سے اس کے والدین کی رشتہ داری کا انکشاف اسے خوشیوں کی دنیا میں واپس لے آتا ہے۔ اس ناول کا اختتام خوشی پر ہوتا ہے اگرچہ تمام ناول اذیت سے لبریز زندگی کی عکاسی کرتا ہے جو ڈکنز کا خاصہ ہے۔

ناول "Oliver Twist" (1837-38ء) مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ناولسٹ کی اخلاقی سوجھ بوجھ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ برائی کی آخر میں فتح ہو۔ ڈکنز دکھاتا ہے کہ اگر برائی کا لگاتار پیچھا کیا جائے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ خوشیاں غموں پر غالب آجاتی ہیں یہ ناول غریب گھرانے میں معاشرتی اصلاح کی تجویز دیتا ہے اور Bumble جیسے سخت دل انسانوں کی برطرفی کے لیے قوانین نافذ کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس ناول میں بچوں کی بہتر نگہداشت کے لیے پرجوش

اپیل کی گئی ہے۔

ناول "Dombey and Son"(48-1846ء) میں ایک مغرور سوداگر کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کے آغاز میں قاری Mr.Dombey سے متعارف ہوتا ہے جو ایک مغرور سوداگر ہے۔ وہ ایک فرم "Dombey and Son" کا مالک ہے۔ وہ ایک بیٹے کا باپ ہے جس کا نام Paul Dombey ہے۔ مسٹر ڈامبے کی بیوی بیٹے کی پیدائش کے وقت مرجاتی ہے۔ Dombey اپنے بیٹے Paul Dombey کی بڑے مغرورانہ انداز میں پرورش کرتا ہے۔ اور اسے Mr.Blimber کے سکول میں داخل کراتا ہے۔ Paul کے ساتھ سکول میں اچھا سلوک نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے وہ بیمار ہو جاتا ہے اور مرجاتا ہے Dombey اپنے بیٹے کی وفات کے بعد اپنی بیٹی Florance کی طرف سے غفلت برتتا ہے وہ اس کے ملازم Walter Gay سے محبت کرنے لگتی ہے۔ مغرور Dombey اس محبت کو ناپسند کرتا ہے اور Walter Gay کو West Indies بھیج دیتا ہے۔ تاکہ ان کی محبت بارآور نہ ہو۔ Dombey دوسری شادی کر لیتا ہے لیکن اس کا غرور اور ڈھٹائی اس کی دوسری بیوی کے لیے پریشانی کا باعث بنتے ہیں نتیجتاً وہ Dombey کے منیجر Carker کے ساتھ فرانس بھاگ جاتی ہے۔ Dombey ان کا پیچھا کرتا ہے کیونکہ وہ اس کی تذلیل کا باعث بنتی ہے۔

Carker ریل گاڑی عبور کرتے ہوئے مارا جاتا ہے۔ ان پے درپے واقعات سے Dombey عاجز آجاتا ہے۔ اسے کاروبار میں بے پناہ نقصان پہنچتا ہے اور وہ مکمل طور پر تباہ ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے بقیہ ایام تنہائی میں بسر کرتا ہے جہاں وہ اپنی بیٹی Florance سے دوبارہ ملتا ہے جو اس کی دکھ بھری زندگی میں سکون کا باعث بنتی ہے۔

ناول ''David Copperfield''(1850-1849ء) میں ایک ذہین اور حساس بچے کی دکھ بھری زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس کا باپ مر چکا ہے۔ ڈیوڈ بتاتا ہے۔

> "I was a posthumous child. My father's
> eyes had closed upon the light of this world six
> months when mine opened on it."(17)
> (P-3)

ڈیوڈ کی ماں "Clara" اپنے بچے سے بے انتہا محبت کرتی ہے وہ اپنی ماں کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس کی یہ پرسکون زندگی اس وقت تباہ ہو جاتی ہے جب Mr.Murdstone اس کی ماں کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے۔ David کا سوتیلا باپ Mr.Murdstone ڈیوڈ پر بہت ظلم کرتا ہے۔ اپنی ماں سے سیکھے ہوئے الفاظ اسے آسان اور دلچسپ لگتے تھے مگر اب اسے یہ Murdstone سے سیکھنے پر روکھے پھیکے مشقت طلب اور ناخوشگوار لگتے ہیں۔ Murdstone اور اس کی بہن کی موجودگی میں David Copperfield لڑکھڑا جاتا ہے اور جب Murdstone اس کی یاداشت کو تیز کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں چھڑی تھام لیتا ہے تو معصوم اور ننھے بچے کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور تشدد کے دوران ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔

''وہ سنجیدگی کے ساتھ آہستہ آہستہ مجھے میرے کمرے کی طرف لے گیا ...... اور جب ہم وہاں پہنچے تو اس نے میرے سر کو اچانک اپنے بازو تلے مروڑا۔ مسٹر مرڈسٹون مجھے مہربانی کر کے نہ پیٹیں میں نے سیکھنے کی کوشش کی ہے جناب! لیکن جب آپ اور Miss.Murdstone میرے قریب ہوتے ہیں تو میں نہیں سیکھ سکتا''۔ ''ہاں بے شک تم یاد نہیں کر سکتے ڈیوڈ! ہم کوشش کر کے دیکھتے ہیں''۔ مسٹر مرڈسٹون نے کہا۔ اس نے میرے سر کو اپنے شکنجے میں کس لیا لیکن میں کسی نہ کسی طرح ٹیڑھا ہو کر گھوم گیا اور اسے لمحہ بھر کے لیے روک دیا اور اس سے التجا کی کہ وہ مجھے نہ مارے یہ تو بس لمحہ بھر کے لیے تھا کہ میں نے اسے روکا۔ اس نے اگلے لمحے بڑی شدت کے ساتھ مجھے پیٹا اور اسی لمحے میں نے اس کے بازو کو پکڑ لیا جو اس نے میرے منہ پر رکھا ہوا تھا اور اسے دانتوں سے کاٹ لیا...... اس نے مجھے اتنا مارا گویا وہ مجھے جان سے مار دے گا ...... پھر وہ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر چلا گیا اور میں بخار اور بیماری کی حالت میں وہیں فرش پر پڑا رہا۔''(18)

(P-60-61)

David رینگتے ہوئے آئینہ تک پہنچتا ہے اور اس میں اپنے چہرے کو دیکھتا ہے جو اسے مغموم اور بد صورت دکھائی دیتا ہے۔ اپنی صورت دیکھ کر وہ ڈر جاتا ہے۔ مار پیٹ سے اس کے چہرے پر داغ پڑ گئے ہیں جن سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔ اپنی حالتِ زار پر وہ پھر سے رونے لگتا ہے۔ کسی جرم کے بغیر وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ڈیوڈ کو ایک دور دراز سکول میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ ہوسٹل میں رہتا ہے۔ وہیں اسے اپنی ماں کی وفات کی خبر ملتی ہے۔ اور وہ پوری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ David کی ماں کی وفات کے بعد اسے گھر سے نکال کر ایک معمولی کارخانے میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا جاتا ہے جہاں وہ صبح آٹھ بجے سے شام آٹھ بجے تک کام کرتا ہے۔ David اس کارخانے سے بھاگ نکلتا ہے اور اپنی آنٹی Miss.Betsey کے پاس چلا جاتا ہے وہاں کچھ عرصہ پرسکون زندگی بسر کرتا ہے لیکن آنٹی کی تباہ حالی کے بعد وہ خود معاشی تنگ دستی کو دور کرنے کے لیے Dr.Strong کے ساتھ ایک ڈکشنری پر کام کراتا ہے۔ اسی دوران میں وہ ناول بھی لکھتا ہے جو اس کی شہرت کا باعث بنتے ہیں۔ David کی باقی ماندہ زندگی انتہائی پرسکون گزرتی ہے۔

ناول "David Copperfield" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ڈکنز کی خودنوشت سوانح حیات ہے کیونکہ اس ناول میں David کے ذریعہ جو بھی واقعات بتائے گئے ہیں وہ ڈکنز کی زندگی سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ David کی زندگی اور اس کی مہمات درحقیقت ڈکنز کی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ Micawber کی صورت میں مصنف نے اپنے والد کی تصویر کو دکھایا ہے۔ Murdstone ایک ظالم باپ کی علامت ہے۔ Peggotty ایک مہربان آیا ہے۔ Betsey Trotwood ایک رحم دل اور عجیب دغریب خاتون ہے یہ تمام افراد اس ناول کے معروف کردار ہیں۔

Dickens خود اس ناول کو بے حد پسند کرتا تھا وہ لکھتا ہے:

"Of all my books, I like this the best. It will be easily believed that I am a fond parent to every child my fancy, and that no one can ever love that family as dearly as I love them. But like many fond parents, I have in my heart of hearts a favourite child. And his name is DAVID COPPERFIELD".(19)

نقاد اور قارئین اس بات پر متفق ہیں کہ "David Coppefield" ڈکنز کا بہترین ناول ہے۔ یہ ناول ڈکنز کی سوانح حیات کے بیشتر حصے کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ناول میں معاشرتی اونچ نیچ، خوشیوں اور غموں کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس ناول میں خوشیاں دائمی لے کا مقام رکھتی ہیں۔

ناول "Great Expectations" (61-1860ء) ڈکنز کا شاہکار ناول ہے۔ دولت اور اس کا فرد پر اثر ناول کا مرکزی خیال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دولت افراد کو پراگندہ بنا دیتی ہے۔ ناول طنزیہ اسلوب کا حامل ہے۔ یہ ناول Pip کی کہانی ہے۔ بچپن میں Pip کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ جاتا ہے وہ اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر میں رہتا ہے جس کے آس پاس متعفن دلدلیں ہیں اور دلدلوں کے آخر میں دریا ہے۔ گھر کے قریب قبرستان ہے جہاں سہ پہر کے بعد ننھے منے Pip کو اچانک ایک قیدی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو "Hulk" نامی قید خانے سے بھاگ نکلا ہے یہ قیدی Pip سے کھانے کے لیے کچھ خوراک اور درانتی طلب کرتا ہے جو Pip اسے مہیا کر دیتا ہے۔ قیدی، بچے کی اس ہمدردی کو عمر بھر یاد رکھتا ہے اور اسے معزز شخص بنانے کے لیے تمام عمر محنت کرتا ہے۔ ناول بہت زیادہ طنزیہ ہے اسلئے کہ Pip کو دولت ایک قیدی کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ ایسا قیدی ہے جس سے Pip نفرت کرتا ہے۔ ناول میں Pip کو ترقی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ بتدریج ترقی کرتا ہے۔ وہ لاوارث بچے کی حالت سے لاڈلا امیر لڑکا اور بالآخر عقل منداور پختہ بالغ بن جاتا ہے۔

یہ ناول ایک یتیم بچے کی معاشرے میں اعلیٰ مقام کے حصول کی خواہشات پر مبنی ہے۔ وہ بچہ جس نے زندگی میں کبھی خوشی نہیں دیکھی۔ جس نے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو نہیں دیکھا اچانک ایک انا پرست خوبصورت لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی وقت اسے اپنی غربت اور کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لڑکی کے حقارت آمیز رویہ کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس لڑکی کے لیے محبت کے جذبات برقرار رکھا ہے۔ Estella کے حصول کے لیے Pip کے دل میں ایک معزز شخص بننے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس کے لڑکپن کے خوابوں میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔

زندگی کے ایک موڑ پر اس کے خواب حقیقت کی صورت میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ ایک وکیل "Mr.Jaggers" ان کے گھر آتا ہے اور Pip کو اس کی دیرینہ خواہشات کی تکمیل کی خوشخبری سناتا ہے وہ

اسے اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ اس کا خیر خواہ اس بات کا خواہشمند ہے کہ اس کا نام Pip سے مخفی رکھا جائے۔ Miss.Havisham،Pip کو اپنا خیر خواہ تصور کرنے لگتا ہے اور اپنے خیال میں وسعت پیدا کر کے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ Estella، Miss.Havisham سے اس کی شادی کرانا چاہتی ہے۔ لیکن جب اسے حقیقت حال کا علم ہوتا ہے تو اس کی خواہشات کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اسے یہ جان کر دھچکا لگتا ہے کہ اس کا حقیقی خیر خواہ ایک مجرم "Magwitch" ہے تو اس کی ناکام خواہشات دکھ میں تبدیلی ہو جاتی ہیں۔ مزید جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ Estella جو اس کی خواہشات کا مرکز و محور ہے درحقیقت قیدی "Magwitch" کی بیٹی ہے تو اس کی خواہشات دوسری دفعہ مجروح ہوتی ہیں۔ ناول کا اختتام خوش کن ہے کیونکہ Pip کی Estella سے شادی ہو جاتی ہے۔

اس ناول میں ڈکنز نے مختلف کرداروں کی خواہشات کو دکھایا ہے۔ قیدی Magwitch، Pip کو معزز شخص بنانا چاہتا ہے۔ Pip خود بھی Gentleman بننے کا خواہشمند ہے۔ Miss.Havisham جس نے وقت کو اس لمحے پر روک دیا ہے جب اس کا منگیتر اسے دھوکہ دے گیا ہے۔ یہ خاتون مردوں سے نفرت کرنے لگتی ہے اور ایک لڑکی "Estella" کو پال کر اس کے ذریعہ مردوں کو اس کی طرف راغب کرتی ہے اور پھر اس لڑکی کے دل میں مردوں کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے اس طرح وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کرتی ہے۔ Joe Gargrey بھی Pip کی بھلائی کا خواہشمند ہے۔

ناول ''Bleak House'' (1853ء) میں ڈکنز نے قانون اور قانون دانوں پر بڑی سخت تنقیدی کی ہے کیونکہ قانون لوگوں کی بھلائی کے لئے نہیں بلکہ منفعت اور ذاتی فائدے کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈکنز اس رویہ کو ناپسند کرتا ہے۔

ناول "Little Dorrit" (1855,57ء) کا مرکزی خیال قید خانہ ہے۔ اس کے دیگر بیشتر ناولوں میں یہی تصور نظر آتا ہے کیونکہ ڈکنز کے بچپن کے ساتھ بھی قید خانہ کا تعلق ہے۔ ڈکنز کے والد کو "Marshal Sea Prision" میں قرض کے سلسلے میں چھ ماہ کے لیے قید کیا گیا تھا۔ لیکن یہ تصور ڈکنز کے ذہن میں عمر بھر قائم رہا۔ اس کے نزدیک قید خانہ غیر انسانی علامت ہے۔ قید خانہ انسانی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کی بھی علامت ہے۔ ڈکنز کے تمام ناولوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

شوکت صدیقی کے ناولٹ ''کمین گاہ'' (1945ء) ناول ''خدا کی بستی'' (1957ء) اور ''جانگلوس'' (1989ء) میں امرا کے مظالم منظرِ عام پر لانے کوشش کی گئی ہے۔

ناولٹ ''کمین گاہ'' (1945ء) میں صنعت کاروں کے مظالم کی عکاسی کی گئی ہے۔ صنعت کار ''ترلوکی چند'' ایک ظالم انسان ہے وہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی محنت کا استحصال کرتا ہے ان کے جائز مطالبات ماننے کی بجائے مزدور یونین کے دفتر کو آگ لگوا دیتا ہے۔ ترلوکی چند ''رام بلی'' سے کہتا ہے۔

> ''تم نے اچھا کیا کہ پیٹرول کا ڈبا اپنے ساتھ ہی لے آئے......
> اسے لے جاؤ اور مزدوروں کی یونین کا جو دفتر ہے اسے پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دو'' (20)
>
> (ص:72)

> ''پچھم کی جانب سے آگ کے شعلے ابھر رہے تھے اور رفتہ رفتہ بلند ہوتے جا رہے تھے۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ساتھ ملی جلی آوازوں کا شور بھی ابھر رہا تھا۔ ترلوکی چند اگروال ذرا دیر تک بھڑکتے اور پھیلتے ہوئے سرخ شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے''۔ (21)
>
> (ص:72)

مزدور یونین کے ایک کردار ''عبدل'' کی تقریر کے ذریعہ مزدوروں کے مطالبات کا اندازہ ہوتا ہے۔

> ''ہم تو مالکوں سے صرف اتنا چاہتے ہیں، ہماری مانگیں پوری کر دو۔ ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا ٹنٹا نہیں ہم نے تو جی غلط بات بھی نہیں کہی۔ جو کچھ دوسرے کارخانوں کے مزدوروں کو ملتا ہے اتنا ہی ہم کو بھی ملنا چاہیے۔ جنگ نے ہر چیز مہنگی کر دی ہے۔ ہر روز قیمت بڑھتی ہے۔ مہنگائی نے ہر طرف ہاہا کار مچا دی ہے اس سسری مہنگائی نے کمر توڑ کر رکھ

دی ہے۔ دوسری طرف دبا کے منافع کمایا جا رہا ہے۔ تجوریاں بھری جا رہی ہیں ارے اس میں ہمارا بھی تو حصہ ہے۔ ہم جان لڑا کے کام کرتے ہیں۔ خون پسینہ ایک کرتے ہیں۔ بھیک تو نہیں مانگ رہے ہماری مانگیں نہیں مانو گے، ہم کو دبانے کے لیے یونین کے دفتر میں آگ لگواؤ گے تو اس کا نتیجہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کان کھول کر سن لو۔ ہم مزدور ایسے ہتھکنڈوں سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہمارے صبر کا امتحان نہ لو۔''(22)

(ص:78)

ڈاکٹر انور سدید شوکت صدیقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ طبقاتی نفرت کو ابھار کر نچلے طبقے کو بیدار ہونے اور بالائی طبقے کو تہہ تیغ کر ڈالنے کی کھلی آزادی دیتا ہے۔''

مزدور طبقے کی اپنے حق کے لیے تمام جدوجہد ناکام ثابت ہوتی ہے صنعت کار اُنہیں زبردستی اور ظلم کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ترلوکی چند نہ صرف مزدوروں پر ظلم کرتا ہے بلکہ اپنے منیجر ''نربدا رائے'' کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کی سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی بھی اس کے ظلم سے نہیں بچ سکتے۔ وہ ان پر قاتلانہ حملہ کراتا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ انکے مرنے کے بعد انکی جائیداد کا بھی وارث بن جائے گا اور یوں اپنی سیاہ کاریوں میں مزید اضافہ کر سکے گا۔

شوکت صدیقی نے اپنے ناول ''خدا کی بستی'' (1957ء) کے تمام کرداروں کو مسائل سے دوچار دکھایا ہے۔ ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں۔

''خدا کی بستی'' میں مسیحائیت کم اور اذیت زیادہ ہے بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خاص کردار اساطیری کرداروں کی طرح محض دکھ جھیلنے کو پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی جذباتی زندگی کی بنیاد طوفانوں پر ہے اور وہ ہر لحظہ روح فرسا مصائب کے مقابل ہیں۔''(23)

شوکت صدیقی نے ناول کی ابتداء میں غریب محلے میں رہنے والے بچوں کو دکھایا ہے۔ یہ بچے

لاوارث ہیں۔ ان بچوں میں راجہ، شامی اور نوشا شامل ہیں۔ نوشا کا باپ مر چکا ہے اور وہ ایک ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ راجہ کا باپ فسادات میں مارا جا چکا ہے اور اس کی ماں طوائف بن چکی ہے۔ راجہ ایک بھکاری کی گاڑی گھسیٹتا ہے اور بھیک میں ملے ہوئے پیسوں کو سینما دیکھنے، سگریٹ پینے اور شراب نوشی پر لگا دیتا ہے۔ شامی ایک اخبار فروش ہے۔ تینوں بچے معاشرے کے دھتکارے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نوشا اپنے مالک مکان ''نیاز'' کے کہنے پر عبداللہ مستری کی دکان سے پرزے چراتا اور ایک دن پکڑا جاتا ہے جس کی پاداش میں اسے سزا دینے کے بعد نوکری سے نکال دیا جاتا ہے اب وہ سارا سارا دن آوارہ گردی کرتا ہے۔ ماں سے اسے ایسا کرنے پر ڈانٹ پڑتی ہے تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ راجہ بھی اپنی زندگی سے عاجز ہے۔ انسداد گداگری والے ''بھکاری'' کو اُٹھا کر لے جاتے ہیں تو راجہ کی زندگی کا آخری سہارا بھی چھن جاتا ہے وہ پے در پے مصائب سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نوشا اُسے بچا لیتا ہے۔ راجہ روتے ہوئے کہتا ہے۔

> ''یار تو نے ناحق روک لیا۔ مرجاتا تو اچھا تھا۔ میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا۔ کوئی نہ روتا۔ میرا بیٹھا ہی کون ہے۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن۔ کوئی بھی تو نہیں۔'' اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔''(24)
>
> (ص:94)

راجہ اور نوشا حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے شہر کو چھوڑ کر کراچی چلے جاتے ہیں اُنہیں پوری اُمید ہے کہ کراچی پہنچ کر ان کے دکھوں ازالہ ہو جائے گا۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہ جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ رحمان نامی آدمی اُنہیں شاہ جی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ شاہ جی راجہ اور نوشا کو لوگوں کے گھروں پر ملازم رکھوا کر ان کے گھر کی قیمتی اشیاء اور جائے اثاثہ کے بارے میں دریافت کرتا ہے کہ وہ کہاں رکھی ہیں اور پھر ایک دن گھر کے افراد کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، شاہ جی ان کے گھر کی قیمتی اشیاء، راجہ کی نشاندہی سے اڑا لے جاتا ہے۔ نوشا اور راجہ شاہ جی کی قید سے نکل بھاگتے ہیں اور انجینئر کے گھر پہنچ کر اُنہیں حقیقت حال سے آگاہ کرتے ہیں۔ لیکن پولیس انہیں پکڑ لیتی ہے

اور انہیں ایک ایک سال قید با مشقت کی سزا سنائی جاتی ہے۔ راجہ کو جیل میں ہی کوڑھ کا مرض لگ جاتا ہے اور اسے ہسپتال بھیج دیا جاتا ہے۔ نوشا کی ایک لڑکے ''پوکر'' سے دوستی ہو جاتی ہے۔ پوکر جیب کترہ ہے۔ قید سے آزاد ہونے کے بعد پوکر اسے اپنے استاد ''پیڈرو'' کے پاس لے جاتا ہے۔ اور یوں نوشا بھی جیب کترہ بن جاتا ہے۔

نوشا کا مالک مکان نیاز، نوشا کی ماں ''رضیہ'' سے وقتی طور پر نکاح کر لیتا ہے وہ اس بات کے انتظار میں ہے کہ ''رضیہ'' کے مرنے کے بعد وہ نوشا کی بہن ''سلطانہ'' سے شادی کر لے گا۔ نیاز اپنی بیوی کی زندگی کا بیمہ کرا لیتا ہے اور پھر اسے زہریلے انجکشن لگوا کر مار ڈالتا ہے۔ بیمے کی رقم سے شاندار کوٹھی اور کار خرید لیتا ہے۔ نوشا کی بہن سلطانہ اور چھوٹا بھائی انو بھی اپنے سوتیلے باپ نیاز کے ہمراہ کوٹھی میں رہنے لگتے ہیں کیونکہ ان دونوں کا اور کوئی سہارا نہیں۔ نیاز سلطانہ کو اپنی داشتہ بنا لیتا ہے اور انو کو دھتکار کر گھر سے نکال دیتا ہے۔

کراچی سے واپسی پر نوشا کو شامی کے ذریعہ تمام حالات کا علم ہوتا ہے تو وہ نیاز کو قتل کر دیتا ہے اور اس کی پاداش میں چودہ سال قید با مشقت کی سزا پاتا ہے۔

اس ناول میں مصنف نے معاشرے کو سدھارنے کے لیے سکائی لارک تنظیم کو بھی دکھایا ہے۔ اس تنظیم میں سلمان، علی احمد، ڈاکٹر زیدی، صفدر بشیر سرِفہرست ہیں۔ ان افراد کا مقصدِ حیات زندگی کی تلخیوں کو کم کرنا ہے۔ وہ پسماندہ علاقوں میں رہنے والے افراد کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشنی سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ وہ ان افراد کے لیے ہسپتال بناتے ہیں۔ خواتین کے لیے انڈسٹریل ہوم قائم کرتے ہیں۔ ان چند افراد نے اپنی زندگیاں اسی مقصد کے لیے وقف کر دی ہیں۔ شوکت صدیقی نے سکائی لارک تنظیم کے برخلاف ظالم طبقہ کی بھی عکاسی کی ہے۔ خان بہادر ظالم طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ سکائی لارک تنظیم کو اپنے مقصد سے ہٹانے کے لیے انہیں روپے کا لالچ دیتا ہے۔ ہسپتال کے لیے جعلی دوائیں استعمال کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن سکائی لارک اپنے مقصد سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں وہ خان بہادر کی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیتے ہیں تو انہیں بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ان کے پایۂ استقلال میں کمی نہیں آتی۔ شوکت صدیقی کے اس ناول کا مرکزی خیال ان چند جملوں سے واضح ہو جاتا ہے۔

''نوشا جیل میں تھا اور پھانسی کے پھندے کے سائے میں کھڑا تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کی قسمت کا فرق ہے۔ خواص، خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی رکشا کھینچتا ہے اور تپ دق میں مبتلا ہو کر خون تھوکتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ تالیاں پٹخار کو کولہے مٹکاتا ہے۔'' (25)

(ص:477)

شوکت صدیقی کے ناول ''جانگلوس'' (1989ء) کا آغاز جیل سے بھاگے ہوئے دو مجرموں سے ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کا نام ''لالی'' اور دوسرے کا نام ''رحیم داد'' ہے۔ لالی اور رحیم داد جیل سے بھاگنے کے بعد اپنے آپ کو بچانے کے لیے پولیس سے چھپتے پھرتے ہیں۔ اس دوران اُنہیں جن جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں سے بہت سے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں جن کے جرائم کو ناول نگار نے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول وڈیروں، لغاریوں، مزاریوں اور جاگیرداروں کی حقیقی زندگی کی قلعی کھولتا ہے۔ ایسے ایسے جرائم منظر عام پر لائے گئے ہیں جن کے تصور سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس معاشرے کے روندے ہوئے افراد کو ان کے مظالم کا نشانہ بنتے دکھایا ہے۔ ڈاکٹر عارف ثاقب اپنے مضمون ''اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک'' میں لکھتے ہیں۔

''جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام انسان کی تمام محرومیوں اور دکھوں کا باعث ہے۔ اس لیے کہ یہ عوام کے ایک بہت بڑے طبقے کو بنیادی ضروریاتِ زندگی سے بھی محروم کر دیتا ہے۔'' (26)

لالی اور رحیم داد اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر ڈالے سفر کر رہے ہیں۔ اُنہیں کچھ خبر نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے سفر کے دوران قسم قسم کے لوگوں سے قاری کو متعارف کراتے ہیں۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے جرائم کو اس طرح منظرِ عام پر لاتے ہیں کہ قاری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور وہ سکتے کے عالم میں لالی اور رحیم داد کے ہمسفر بن کر جرائم کی دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

مصنف نے لالی اور رحیم داد کے ذریعہ ڈاکوؤں کی زندگی کی قلعی بھی کھولی ہے کہ وہ کس طرح ڈاکہ ڈالتے ہیں اور واردات کرنے کے بعد بھی بے خطر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ہمارے معاشرے میں اس وجہ سے دندناتے پھرتے ہیں کیونکہ پولیس بھی ان کے مال میں برابر کی شریک ہوتی ہے۔ ایسے افراد کی عکاسی اشرف اور اس کے باس کے ذریعہ کی گئی ہے۔ اشرف، لالی کو بتاتا ہے۔

> ''مہینے سوا مہینے میں صرف ایک بار نکلتے ہیں اور تگڑا شکار مارتے ہیں۔ اکیلے نہیں کھاتے مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ بندھا ہے اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔''(27)
>
> (ص:58)

ناول کے ہیرو لالی نے ایسے لوگوں کے چہرے بے نقاب کیے ہیں۔ جو بظاہر نیکی اور اچھائی کا مرقع نظر آتے ہیں۔ زمیندار ''فیض محمد'' ان میں سے ایک ہے۔ یہ شخص لالی کے سامنے اپنے آپ کو نمازی اور پرہیز گار ظاہر کرتا ہے تاکہ اپنی بیٹی طاہرہ (جو ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے) کی شادی لالی سے کرادے اور اس بچے کا باپ لالی کو ٹھہرائے۔ اپنی بات منوانے کے لیے وہ لالی کو مذہب کی مار دیتا ہے۔

> ''برخوردار! آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفے کا ورد کر رہا تھا۔ خلافِ معمول نیند کا ایسا زبردست جھونکا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں، ایک بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔ سفید براق لباس، چہرے کے گرد نور کا ہالہ آنکھوں میں ایسا جلال کہ نظریں خود بخود جھک گئیں۔

کیا بتاؤں کیا شان تھی ان کی ...... چند لمحے خاموش کھڑے میری جانب دیکھتے رہے۔ پھر حکم دیا، فیض محمد! اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حبالۂ عقد میں دے دے جو دو روز سے تیرا مہمان ہے۔ نافرمانی کرے گا تو راندۂ درگاہ ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔''(28)

(ص:93،94)

فیض محمد کی نیک نامی کی قلعی اس کی بیٹی طاہرہ کھولتی ہے۔

''وہ ایک نمبر فراڈ ہیں پہلے تو چار سو بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرالیا۔ پرائمری سکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمیندار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا۔''(29)

(ص:100)

طاہرہ مزید بتاتی ہے کہ اس کا باپ سمگلنگ کرتا ہے اور لالی کو وقتی طور پر داماد بنا کر سمگلنگ کے کاروبار میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔

مصنف نے ایسے افراد کی سیاہ کاریوں سے روشناس کرایا ہے جن کی ظاہری شخصیت لوگوں کے لیے عزت و تکریم کا موجب ہے لیکن ان کا باطن شیطان سے بھی زیادہ مکروہ ہے۔ یہ طبقہ ملکی معیشت پر آکاس بیل کی طرح قابض ہے۔

لالی ''پولی نیسین کلب'' میں جاتا ہے تو وہاں کے ماحول سے قاری کو آگاہ کرتا ہے۔ پولی نیسین کلب میں امپائر کا رول ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے اعلیٰ افسران کی گھناؤنی زندگی سے متعارف کراتا ہے۔ اس کلب کے ممبران میں شیخ حمید مگوں، ریلوے کا افسر چوہدری محمد نواز بھنڈر، ایس پی مرزا ابوالحسن، ڈپٹی کمشنر ہمدانی، ڈاکٹر بٹ، محکمہ آبادکاری کا ایڈیشنل کمشنر مسعود، مہر سلمان اور ان کی بیویاں مہ جبیں، فاخرہ، سائرہ، نوشابہ، ماہ رخ، امینہ اور راحیلہ شامل ہیں۔ Rleasure House کے تمام ممبران ہر ماہ کی ایک رات ایسی گزارتے ہیں جسے انہوں نے سسپنس نائٹ کا نام دیا ہے۔ اس رات تمام افراد اپنی بیویوں کا آپس

میں لاٹری کے ذریعہ تبادلہ کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک رات کو جب پولی نیسین کلب کے ممبران نشے میں مخمور اپنی قسمت کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ سکھیر اُنہیں ریل گاڑی کے حادثے کے بارے میں مطلع کرتا ہے۔

''سر کوئی دو گھنٹے پہلے گیمبر سٹیشن کے نزدیک دو ٹرینیں ٹکرا گئی ہیں۔ زبردست حادثہ ہوا ہے۔ ابھی تک گیارہ کے مرنے کی اطلاع ہے۔ زخمی تو بہت سے ہیں۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہے۔''(30)

(ص:300)

یہ خبر سننے کے بعد بھی قانون کے محافظوں کے دل موم نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اپنے پروگرام کو ملتوی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اس بات پر پریشان ہیں کہ یہ حادثہ ان کے پروگرام میں خلل انداز ہوا ہے۔ ایڈیشنل کمشنر مسعود تو یہاں تک کہہ دیتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کون سی ایسی قیامت آ گئی گیارہ افراد ہی تو ہلاک ہوئے ہیں کچھ اسپتال جاتے جاتے یا اسپتال پہنچ کر ہلاک ہو جائیں گے۔''

نوشابہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کا تعلق تو محکمہ آبادکاری سے ہے۔'' مسعود مسکرا کر بولا۔ ''نوشابہ! تم میری نفسیات نہیں سمجھ سکتیں۔ میں برسوں مشرقی بنگال میں رہا ہوں۔ وہاں ہر سال قحط، سیلاب اور سائیکلون سے ہزاروں افراد مر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جتنے لوگ ہر سال مر جاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ موت اور زندگی کا کھیل ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آ جاتا ہے...... لالی گم سم بیٹھا، حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی باتیں ہیں؟''(31)

(ص:304)

شوکت صدیقی نے اعلیٰ افسران کی ظاہری نیک نامی اور شان و شوکت کے پیچھے ان کے گھناؤنے جرائم سے پردہ اُٹھایا ہے۔ وہ ان لوگوں کے اصل چہروں سے قاری کو روشناس کراتا ہے جن پر ہمیشہ عصمت و تقدس کے غلاف چڑھے رہے۔

شوکت صدیقی نے رحیم داد کے ذریعہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی عیاشیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے افراد انسانی ہمدردی سے عاری ہیں وہ جائیداد کے حصول کے لیے اپنے بھائیوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ زمیندار شہ زور مزاری اپنے سوتیلے بھائی کو زہر دے کر مار ڈالتا ہے اور سگے بھائی کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ شہ زور کی سوتیلی ماں ''مرجان'' رحیم داد کو بتاتی ہے۔

> ''شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی نے میرے پتر کو زہر دے کر مار ڈالا تھا''۔ مرجان کا لہجہ تلخ ہو گیا ''شہ زور نے دو سال بعد اپنے بھائی کو بھی مار ڈالا۔ سردار نجیب کا پہلے ہی مرن ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے پوری جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے کیا تھا۔'' (32)
>
> (ص:245)

زمینداروں اور جاگیرداروں نے اپنے شوق کی تسکین کے لیے Dog Houses بنا رکھے تھے جن میں عمدہ نسل کے کتے رکھے جاتے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ''کوتی'' مقرر ہوتے۔ کتوں کو عمدہ سے عمدہ خوراک مہیا کی جاتی۔ اگر کوئی رکھوالہ کتوں کی خوراک میں سے کچھ چرا لیتا تو اسے کربناک سزا دی جاتی۔ اسے کتوں کے آگے پھینک دیا جاتا۔ زمیندار مراد خان کو اپنے Dog House میں جب ایک بچہ گوشت کھاتے ہوئے نظر آتا ہے تو شاہانی اسے کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے۔ بچے کی ماں معافی مانگتی ہے لیکن بے رحم کے دل پر اثر نہیں ہوتا۔

> ''سردار شاہانی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''دروازہ کھول''۔ اس نے لوہے کے جنگلے کی جانب اشارہ کیا جس میں کتے بند تھے۔ اس نے مڑ کر بچے کو دیکھا ''اسے بگھیلے کے سامنے ڈال دے''۔
>
> ''سردار سئیں ایسا نہ کر'' عورت نے تڑپ کر کہا۔ ''اسے معافی

دے دے''۔ ''چپ کر''۔ شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

مگر وہ چپ نہ رہی۔ ''سزا ہی دینی ہے تو مجھے کتوں کے سامنے ڈال دے''۔ یہ کہتی ہوئی وہ مراد خان کے قدموں پر جھکی۔ مراد خان شاہانی نے اس کے پیٹ پر زور سے لات ماری ''ہٹ جا سامنے سے'' عورت لات کھا کر گری اور زمین پر دور تک گیند کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ مراد خان نے رمضے کو حکم دیا۔ ''منہ کیا تک رہا ہے؟۔ دروازہ کھول'' اس نے بچے کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ ''اسے اندر ڈال دے''۔

رمضے نے آگے بڑھ کر جنگلے کے دروازے کا قفل کھولا، واپس آیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر جنگلے کی سمت بڑھا۔ بچے نے تلملا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ رمضے نے جھٹکا دے کر اسے زور سے کھینچا۔ بچہ سہم کر دم بخود رہ گیا۔ رمضا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا، دروازہ کھولا اور دھکا دے کر بچے کو جنگلے کے اندر پھینک دیا۔ بچے کے اندر پہنچتے ہی کئی کتے غرا کو زور زور سے بھونکنے لگے...... بل ٹیریر نے اسے فرش پر گرا دیا تھا اور دانت نکال کر اس کا بدن جھنجھوڑ رہا تھا۔ بچہ تکلیف سے بے چین ہو کر چیخا۔ ''اماں''!

اس کی آواز کے ساتھ ہی ماں نے رحیم داد کے پیروں پر زور سے سر مارا اور مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ وہ بار بار دہائی دیتی۔ ''میں صد کے تھیواں، سئیں! میں کوں معافی دلا دے، سردار تیری سن لے گا''

وہ بلبلا کر چیخی۔ ''بچا لے میرے نکے کو سئیں بچا لے اسے''۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عورت کی بے قراری دیکھ کر رحیم داد کا دل پسیج گیا۔ ماں کی مامتا اس کے قدموں پر تڑپ رہی تھی، گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اس نے دل

کے ہاتھوں مجبور ہو کر سردار مراد خان شاہانی کی جانب دیکھا، اس کی طرف جھکا، ایک ہاتھ آگے بڑھایا، ٹھوڑی چھو کر عاجزی سے بولا۔

''سردار شاہانی! اسے معافی دیدے۔ میری خاطر معاف کر دے''۔ مراد شاہانی نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ خونخوار نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ چند لمحے رحیم داد کی جانب گھورتا رہا پھر اس نے مڑ کر اپنے بل ٹیریر پر نظر ڈالی۔

''بگھیلے! چھوڑ دے اسے''۔

کتے نے دھیان نہیں دیا، بدستور بچے کو بھنبھوڑتا رہا۔ سردار شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔ ''ہٹ جا بگھیلے''۔ کتا اس قدر سدھا ہوا تھا کہ ڈانٹ سنتے ہی اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔ گردن اُٹھا کر شاہانی کو دیکھا، اپنی جگہ واپس گیا اور گردن جھکا کر راتب کھانے لگا۔

شاہانی نے رمضے کو حکم دیا۔ ''رمضے!! اسے باہر نکال لے۔'' اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''چوہدری میرا مہمان ہے اور مہمان کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔'' (33)

(ص:318،319،320)

یہ منظر دیکھ کر قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سماج کی یہ جھلکیاں ہر لحہ قاری کے علم میں اضافہ کرتی ہیں۔

زمینداروں کی ذاتی کچہریاں لگتی تھیں۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے فیصلے سناتے۔ ان کے فیصلوں کے خلاف آواز اٹھانے کی کسی فرد میں جرأت نہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے اپنے علاقوں کے حاکم ہوتے۔ ظالم حکمرانوں کی طرح حکم صادر کرتے۔ ان کی نظر میں مظلوم انسان کی حیثیت کوڑی کے برابر بھی نہ تھی۔ وہ اپنے مزارعوں کو ہر طرح سے ذلیل کرتے ان کی بیٹیاں اور بیویاں اٹھوا لیتے۔ ان خواتین کو ''کوٹ'' میں رکھا جاتا۔ یہ خواتین جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ ان کے مہمانوں کی دلجوئی کا باعث بنتیں۔ یہ جاگیردار ''شہنشاہ نیرو'' (34)

اور ''چنگیز خان'' (35) کی یاد تازہ کرا دیتے۔

شوکت صدیقی نے اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے افراد کو بھی دکھایا ہے۔ جو اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر حیران ہیں۔ وہ ان بھٹوں پر صبح سے شام تک کام کرتے ہیں لیکن سخت محنت کے باوجود بھی انہیں پیٹ بھر کر خوراک نہیں ملتی۔ اُنہیں ان کی محنت سے کئی گنا کم معاوضہ ملتا ہے۔ اگر وہ احتجاج کرتے ہیں تو انہیں سزا کے طور پر چھتر مارے جاتے ہیں۔ ان پتھیروں کی بیٹیاں بھی مالکان کی درندگی کا شکار ہو جاتیں ہیں۔ سلامو پتھیرے کی بیٹی کو بھٹے کا مالک اسلم اٹھوالیتا ہے سلامو احتجاج کرتا ہے اور بیٹی کو واپس لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اس کی بیٹی تو واپس نہیں ملتی البتہ اذیت ناک سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ اسے جلتے توے پر کھڑا رہنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

> ''سلامو کو بھٹے کے دہکتے ہوئے توے پر کھڑا کر دیا گیا اس کے پیر برہنہ تھے۔ توے پر پہنچتے ہی اس کے تلوے سلگنے لگے۔ اس نے تکلیف اور جلن برداشت کرنے کی غرض سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ تپتے توے سے وہ نیچے نہ اتر سکتا تھا۔ دو کارندے اس کی نگرانی پر مامور تھے اور نہایت چوکس کھڑے تھے۔ سلامو بار بار پیر پٹختا۔ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتا اس کے پیر جھلستے رہے، سلگتے رہے، اس نے بے بسی سے گردن ہلائی۔ درد سے تلملایا، منہ پھاڑا اور بے اختیار چیخ نکل گئی۔'' (36)
>
> (ص:485)

اینٹوں کے یہ بھٹے جیل سے مشابہ تھے اگر کوئی پتھیرا یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا تو اسے پکڑ لیا جاتا اور سخت سے سخت سزا دی جاتی۔ لالی کہتا ہے۔

> ''یہاں کام کرنے والا ہر بندہ کیدی ہے۔ یہ تو جیل ہے سرکاری جیل سے بھی بڑی۔'' (37)
>
> (ص:661)

غلام نبی اپنے مقالے ''شوکت صدیقی بحیثیت افسانہ نگار'' میں لکھتے ہیں۔

''یہ استحصالی طبقات مختلف بھیس بدل بدل کر عوام کو لوٹتے ہیں کبھی تو یہ کسی سرمایہ دار کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور کبھی جاگیرداری کی شکل میں اور کبھی قانون کے محافظوں کی صورت میں ان سب کی نظر صرف اپنے منافع پر ہوتی ہے خواہ اس کے لیے انہیں کتنے ہی کسانوں کی محنت کا خون ہی بہانا پڑے۔''(38)

شوکت صدیقی کا یہ ناول زندگی کی تلخیوں اور ظلم و جبر کے خلاف منہ بولتا ثبوت ہے۔ مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دونوں کے ناول معاشرتی مسائل کی واضح تصویر منظر عام پر لاتے ہیں۔ چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کی تحریروں میں زندگی پر تنقید (Criticism of Life) کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں انقلابی ادیب کہا جا سکتا ہے۔ انقلابی ادیب میں مشاہدہ (Observation)، اظہار (Expression) اور سماجی مسائل کو حل کرنے میں اس کی عملی شرکت یہ تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی انقلابی رائٹر کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ ڈکنز کے ابتدائی حالات پسماندگی میں گزرے۔ شوکت صدیقی کو بھی پاکستان آنے کے بعد بے شمار معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان مسائل کو انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ دونوں ادیبوں نے انہی نا مساعد حالات میں اپنے لیے راستہ بنایا ذاتی محرومیوں اور مسلسل جد و جہد کے علاوہ غربت کے مارے ہوئے مظلوم لوگوں کے پیہم مشاہدے نے ان پر ایسا اثر ڈالا کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسی طبقے کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ شوکت صدیقی کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے بھی رہا ہے۔

''مظہر رضوی کے ساتھ ساتھ میرا بھی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ اس حد تک تعلق پیدا ہو گیا کہ میں پارٹی کا قریبی ہمدرد اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ میں اس کا باقاعدہ جز وقتی (پارٹ ٹائم) رکن بن گیا۔ چند ماہ جیل میں بھی رہا۔ اسی نظریاتی رشتے کی بنیاد پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گیا۔''(39)

ڈکنز کی تحریروں کو پڑھ کر بعض نقادوں نے ڈکنز کو بھی کمیونسٹ کہا ہے ۔ اس بات کا اظہار Humphry House نے اپنی کتاب "The Dickens World" میں کیا ہے۔

> ’’Gissing اور Chesterton سمیت کئی انگریز مصنفین نے ڈکنز کی تاریخ اور اس کی اصلاحی قوت کے بارے میں تو لکھا ہے لیکن انہوں نے ڈکنز کی ترجمانی تقریباً اس کے عہد کے Beliefs کی بجائے اپنے Beliefs پر کی ہے۔ Mr.Edwin نے اپنی کتاب "Charles Dickens, Apostle of the People" میں چارلس ڈکنز کے سوشلسٹ عناصر اس کے ادب پاروں میں نوٹ کئے۔ اور M.T.A.Jackson نے اپنی کتاب "Mr.Dickens: The Progress of a Radical" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ڈکنز موت کے وقت مارکسی کمیونسٹ تھا۔ لیکن صرف Mr.Cazamian میں "Le Roman Social en Angleterre" نے کچھ تفصیل کے ساتھ ڈکنز کی سوشل اور پولٹیکل تحریروں کو اس کے اپنے دور کے خیالات سے وابستہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ انگریز ادیبوں پر اتنا اثر نہ ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا۔‘‘(40)

ڈکنز کمیونسٹ تھے یا نہیں تھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ڈکنز معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے خواہاں تھے ۔ ایسا انقلاب جس میں غریب کو بھی اس کی محنت کا پورا پورا صلہ دیا جائے ۔ ڈکنز نے اپنی زندگی میں مستحقین کی عملی طور پر مدد بھی کی ۔

> ’’ڈکنز فلاح و بہبود میں خود حصہ لیتا اور دوسروں کو بھی اس میں شریک ہونے کے لیے تبلیغ کرتا۔ اپنی ذاتی زندگی میں اس نے اپنے والدین، بہن بھائیوں اور اپنی سالیوں Hogarths کی بھلائی کے لیے کافی کچھ کیا۔ عوام میں اس نے خیراتی ادارے منظم کیے اور کثیر رقوم چندے کے طور پر دیں۔‘‘(41)

شوکت صدیقی نے بھی نچلے متوسط طبقے کی اصلاح کے لیے کوششیں کیں۔

''ایک زمانے میں اردو کے مشہور افسانہ نگار حیات اللہ انصاری نے تحریک تعلیم بالغاں شروع کی۔ان کی تحریک میں شامل افراد خیالات کے اعتبار سے قوم پرست تھے۔ میں ان نوجوانوں میں شامل تھا۔ انصاری صاحب نے پسماندہ علاقوں میں تعلیم کے فروغ کے لیے مختلف مراکز قائم کئے تھے۔ ان بستیوں میں جا کر ہم لوگوں کو تعلیم دیتے اور ہر ہفتے اپنے مرکز کی رپورٹ اجتماعی میٹنگ میں پیش کرتے انصاری صاحب انچارج کی حیثیت سے ہمارے کام کا جائزہ لینے کے لیے عین اس وقت جب ہم، لوگوں کو پڑھا رہے ہوتے تھے، موقع پر پہنچ جاتے اور خاموشی سے پیچھے کھڑے رہتے...... ہم نے پیٹرومیکس، لالٹین، بورڈ، چاک وغیرہ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اور طریقۂ تعلیم یہ تھا کہ ان پڑھ باشندوں کو حروفِ تہجی کے بجائے صوتی اعتبار سے لفظوں کی شکلوں سے آگاہ کرایا جائے۔ جب ہم نے تعلیم دینا شروع کی تو مسائل ابھر ابھر کر سامنے آئے مثلاً کوئی شاگرد بیمار پڑا تو بستی میں اس کے علاج معالجے کی سہولت نہیں ہے کوئی بیروزگار ہے تو اس کی نوکری کا بندوبست نہیں ہورہا۔ کسی علاقے میں ملیریا پھیل گیا ہے تو لوگ سنٹر بند کر دینا چاہتے ہیں کہ کہیں بیماری پھیل نہ جائے۔ تب ہم نے اپنے اجلاس میں فیصلہ کیا کہ ان بستیوں میں ہاسپٹل اور دار المطالعے بھی قائم کئے جائیں۔'' (42)

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دنیا کے غموں اور کشمکشِ حیات کی عکس بندی کرتے ہوئے ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ شوکت صدیقی عدل و انصاف اور انسانیت کا متلاشی ہے۔ اور ڈکنز انسانیت کے حق میں انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ دونوں نے بے راہ روی اور جرائم کو چھپانے کی بجائے بے

نقاب کیا ہے۔شوکت صدیقی مفلسی کے شکار اور حالات کے روندے ہوؤں کی عکس بندی کرتا ہے۔ ڈکنز کی حقیقت نگاری کی بنیاد غربت کے دکھوں کا تصور ہے۔شکوت صدیقی نے قوم کو جھنجوڑ کر اس کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ ڈکنز نے تھامس کارلائل کی طرح عوام کے ضمیر کو بیدار کیا ہے۔ دونوں نے امیر کو Villain اور غریب کو دکھوں کے درمیان جینے والا ہیرو دکھایا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ Sir Ifor Evans, "A Short History of English Literature P.179, Penguin Books, 1963.

2۔ Humphry House, "The Dickens World", P.10, Oxford University Press, 1971.

"The great novelist, like others of his time, was a reformer. His stories, whether sad or humorous, often served as a protest against the abuses of the social and political life of his time."

3۔ Ibid, P.10.

"Dickens history is inseparable from Dickens reformism ..... and even accentuates an interest in Dickens's exposure of past abuses; self-congratulation harmonizes only too easily with the christmas spirit. Debtors are no longer jailed; money - lenders are more strickly supervised; and a parishboy who asks for more can be sent to a clinic for analysis. Good as the old days were, the new are in some ways better, and Dickens, helped to make them so."

4۔ اے۔ بی اشرف، ڈاکٹر "خدا کی بستی..... ایک عوامی ناول"، ص:76 مشمولہ "ادب اور سماجی عمل، ملتان، کاروانِ ادب، 1980

5۔ ایضاً ص:83، ۔

6۔ گلزار جاوید "براہِ راست" ص:18، مشمولہ ماہنامہ "چہارسو" راولپنڈی مارچ، اپریل 2001۔

7۔ Charles Dickens, "A Tale of Two Cities", P.13, Penguin Books, 1994.

"It was the best of times, it was the worst of times, it was the age of wisdom, it was the age of foolishness .... it was the season of Light, it was the season of Darkness, it was the spring of hope, it was the winter of despair in short, the period was so far like the present period."

Ibid, P.38. -8

Ibid, P.116,117. -9

He took out his purse.

"It is extraordinary to me", said he, "that you people cannot take care of yourselves and your children. One or the other of you is for ever in the way. How do I know what injury you have done my horses?

See! Give him that."

He threw out a gold coin for the valet to pick up, and all the heads craned forward that all the eyes might look down at it as it fell. The tall man called out again with a most unearthly cry, "Dead!"

He was arrested by the quick arrival of another man, for whom the rest made way. On seeing him, the miserable creature fell upon his shoulder, sobbing and crying, and pointing to the fountain, where some women were stopping over the motionless bundle, and moving gently about it. They were as silent, however, as the men.

I know all, I know all," said the last comer. "Be a brave man, my Gaspard! It is better for the poor little plaything to die so, than to live. It has died in a movement, without pain. Could it have lived an hour as

happily?"......

Without deigning to look at the assemblage a second time, Monsieur the Marquis leaned back in his seat, and was just being driven away with the air of a gentleman who had accidently broken some common thing, and had paid for it, and could afford to pay for it; when his ease was suddenly disturbed by a coin flying into his carriage, and ringing on its floor.

"Hold!" said Monsieur the Marquis. "Hold the horses! who threw that?"

He looked to the spot where Defarge the vendor of wine had stood a mement before; but the wretched father was grovelling on his face on the pavement in that spot, and the figure that stood beside him was the figure of a dark stout woman, knitting.

"You dogs!" said the Marquis.

"I would ride over any of you very willingly, and exterminate you from the earth. If I knew which rascal threw at the carriage, and if that brigand were sufficiently near it, he would be crushed under the wheels".

Ibid, P.214. -10

"With a roar that sounded as if all the breath in France had been shaped into the detested word, the living sea rose, wave on wave, depth on depth, and overflowed the city to that point Alarm-bells ringing, drums beating the sea raging and thundering on its new beach, the attack began."

Charles Dickens, "Hard Times, P.123, Penguin Books, 1994. -11

"Oh my friends, the down-trodden operatives of Coketown! Oh my friends and fellow - countrymen, the slaves of an ironhanded and a grinding despotism! Oh my friends and fellow - sufferers, and fellow - workmen, and fellow-men! I tell you that the hour is come, when we must rally round one another as on united power, and crumble into dust the oppressors that too long have battened upon the plunder of our families."

Ibid, P.19. -12

"It was a town of red brick, or of brick that have been red if the smoke and ashes had allowed it, but as matters stood it was a town of unnatural red and black like the painted face of a savage. It was a town of machinery and tall chimneys, out of which interminable serpents of uncoiled. It had a black canal in it, and a river that ran purple with ill-smelly dye, and vast piles of building full of windows where there was a rattling and a trembling all day long, and where the piston of the steam - engine worked monotonously up and down like the head of an elephant in a state of melancholy madness. It contained several large streets all very like one another, and many small streets still more like one another, inhabited by people equally like one another, who all went in and out at the same hours, with the same sound upon the same pavements, to do the same work, and to whom every day was the same as yesterday and to - morrow, and every year the counterpart of the last and the next".

Charles Dickens, "Old Curiosity Shop", P.314, -13
Collins London And Glasgow, 1972.

"Towards the afternoon her grandfather complained bitterly of hunger. She approached one of the wretched hovels by the way - side, and knocked with her hand upon the door.

"What would you have here?" said a gaunt man, opening it. "Charity. A morsel of bread".

"Do you see that?" returned the man hoarsely, pointing to a kind of bundle on the ground."That is a dead child. I and five hundred other men were thrown out of work three months ago. that is my third dead child, and last. Do you think I have charity to bestow or a morsel of bread to spare?"

The child recoiled from the door, and it closed upon her. Impelled by strong necessity, she knocked at another, a neighbouring one, which yeilding to the slight pressure of her hand, flew open".

Andrew Sanders, "Charles Dickens Resurrectionist", P.82, -14
The Macmillan Press Ltd., 1982.

"Nell and her grandfather move gratefully on __'They had never longed so ardently, they had never so pined and wearied, for the freedom of pure air and open country, as now' (Ch.45) __ but their vision of Hell continues two more days and nights leading them along a road lined with human degradation, a kind of spiritual death for those who have to endure

it. Hungry themselves, they are forced to beg food from the starving; homeless, they seek shelter in filthy hovels".

15- Charles Dickens, "Oliver Twist", P.15,Thomas Nelson & Sons Ltd.

16- Ibid, P.15,16.

"The master aimed a blow at Oliver's head with the ladle, pinioned him in his arms, and shrieked aloud for the beadle.

The board were sitting in solemn conclave, when Mr.Bumble rushed into the room in great exitement, and addressing the gentleman in the high chair, said __ "Mr.Limbkins, I beg your pardon, sir! Oliver Twist has asked for more".

There was a general start. Horror was depicted on every countenance.

"For more!" said Mr.Limbkins. "Compose youself, Bumble, and answer me distinctly. Do I understand that he asked for more, after he had eaten the supper allotted by the dietary?"

"He did, sir," replied Bumble.

"That boy will be hung," said the gentleman in the white-coat."I know that boy will be hung".

17- Charles Dickens,"David Copperfield,P.3,Thomas Nelson & Sons Ltd.

18- Ibid, P.60,61.

"He walked up to my room slowly ...... and when we got there, suddenly twisted my head under his arm.

"Mr.Murdstone! sir" I cried to him; "don't! pray don't beat me! I have tried to learn, sir, but I can't learn while you and Miss.Murdstone are by. I can't, indeed!"

"Can't you indeed, David?" he said. We'll try that". He had my head as in a vice; but I twined round him somehow, and stopped him for a moment, entreating him not to beat me. It was only for a moment that I stopped him, for he cut me heavily an instant afterwards, and in the same instant I caught the hand with which he held me in my mouth, between my teeth, and bit it through.

..... He beat me then as if he would have beaten me to death ..... Then he was gone, and the door was locked out-side; and I was lying, fevered and hot, ... upon the floor."

19- Stephen Wall (ed) "Charles Dickens", P.172, Penguin Books, 1970

20- شوکت صدیقی "کمین گاہ" ص:70، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1997۔

21- ایضاً ص:72۔

22- ایضاً ص:78۔

23- حنیف فوق، ڈاکٹر "خدا کی بستی اور اردو ناول نگاری" ص:57، مشمولہ ماہنامہ "دائرے" کراچی، 1989۔

24- شوکت صدیقی، "خدا کی بستی" ص:94، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1995۔

25- ایضاً ص:477۔

26- عارف ثاقب، ڈاکٹر، "اشتراکیت اور ترقی پسند ادب" ص:76، مشمولہ "بیسویں صدی کا ادبی طرزِ احساس" لاہور، اظہار سنز پرنٹرز، 1999ء۔

27- شوکت صدیقی، "جانگلوس" (جلد اول) ص:58، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1998ء۔

28۔ ایضاً،ص93،94۔

29۔ ایضاً،ص100۔

30۔ ایضاً،ص300۔

31۔ ایضاً،ص304۔

32۔ شوکت صدیقی،''جانگلوس''(جلد سوم)ص:245،کراچی،رکتاب پبلی کیشنز،1999ء۔

33۔ شوکت صدیقی،''جانگلوس''(جلد دوم)ص:318,319,320،کراچی رکتاب پبلی کیشنز1998۔

34۔ شہنشاہ نیرو ملک روم کا ظالم بادشاہ تھا جو اپنے شہروں کو آگ لگوا کر چین کی بانسری بجا تا رہا تھا۔

35۔ چنگیز خان ظالم و جابر حکمران تھا۔جس نے انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کیئے تھے۔

36۔ شوکت صدیقی''جانگلوس''(جلد سوم)ص:485۔

37۔ ایضاً،ص661۔

38۔ غلام نبی،''شوکت صدیقی بحثیت افسانہ نگار''ص:56،بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان،غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے۔،1985ء۔

39۔ گلزار جاوید''براہِ راست''ص:14،مشمولہ ماہنامہ''چہارسو''راولپنڈی،مارچ،اپریل2001۔

40۔ Humphry House, "The Dickens World", P.10,11. Oxford University Press, 1971.

"Several English writers (apart from the general critics like Gissing and Chesterton) have dealt with this question of Dickens's history and reformism; but, they have nearly all interpreted Dickens more through their own beliefs than through the beliefs of his time. Mr.Edwin Pugh in Charles Dickens, Apostle of the people' published in 1908, set out, with great sense and knowledge, to show the socialist implications of his work; Mr.M.T.A.Jackson's Charles Dickes: The progress of a Radical

(1937) argues that at his death he was all but a Marxian Communist, and so on. But only M.Chazamian's Le Roman Social en Angleterre 1830-1850 attempts in connexion with its contemporary setting of ideas; and by some accident it seems as much as it might have done".

-41 "Cliff's Notes" Dickens Pickwick papers Notes, P.11, C.K.Hillegass U.S.A, 1970.

"Dickens practised benevolence as well as preached it. In his private life he did many favours for his parents, his brothers and sisters, and his in -laws, the Hogarths. In Public he organised charities and gave benefits, contributing substantial amounts".

-42 طاہر مسعود، ''صورت گر کچھ خوابوں کی'' ص187، 188۔

باب سوم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا تصورِ حیات

باب سوم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا تصورِ حیات

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا نظریۂ حیات دراصل ایک ناختم ہونے والی انسانی جدو جہد کا دوسرا نام ہے۔ معاشرے میں بسنے والے افراد کی طبقاتی تقسیم اور اس پر معاشرے کے اعلیٰ طبقہ کا رویہ ہی دراصل انسانی صعوبتوں اور مصیبتوں کو جنم دیتا ہے۔ یہی صعوبتیں انسان میں ظلم و جبر کے خلاف جہاد کی ترغیب دلاتی ہیں شوکت صدیقی ادر چارلس ڈکنز دونوں انسانی زندگی کو اس کی تمام تر صلاحیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے معاشرتی ناانصافیوں سے دور ایک مثالی اور تصوراتی دنیا (Utopiac World) میں لے جانا چاہتے ہیں دونوں ہی دراصل انقلابی ادیب ہیں البتہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈکنز کی انقلابیت میں ایک ابدی امید اور Optimism کا رنگ نظر آتا ہے۔ جو شوکت صدیقی کے انتہائی تلخ اندازِ بیان میں مفقود ہے۔

عہدِ وکٹوریہ (1837-1901ء) کے تمام ناول نگاروں میں ڈکنز عظیم ناول نگار تھا۔ جس نے قلم کے ذریعہ اس دور کی معاشرتی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کسی مصنف نے نچلے درمیانی طبقے کو اپنے ناولوں کا موضوع نہیں بنایا۔ وہ اُن سے الگ تھلگ اور بالاتر ہو کر اُن کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ انہیں میں سے ایک فرد کی حیثیت سے اور انہیں کی سطح سے معاشرتی صورتحال کا مطالعہ کرتا ہے۔ ہمدردی اور تاثرات کا پورا گروہ اُس کی ناول نگاری میں بکھرا ہوا ہے۔ غم کا اظہار ہو یا مزاح کا درمیانی طبقہ کے لوگوں پر اس کی اور قاری کی توجہ مرکوز کرنے میں اس کے فن کی عظمت ہے یہی اُس کی حقیقت نگاری کی مستقل بنیاد ہے۔ شعور کی اندرونی وسعتوں میں روح کو مجروح کرنے والی غربت کا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ ڈکنز نے اپنے ناولوں میں نہ صرف گرد و پیش کی زندگی کے الم انگیز پہلوؤں کو پیش کرنا اپنا فرض سمجھا بلکہ نسل انسانی کی بہبود کے لیے معاشرتی اصلاح بھی کی۔ غریبوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں نے ڈکنز کو ہلا کر رکھ دیا (1)۔ اساتذہ کے ہاتھوں بچوں کی قابل رحم حالت (2)، قیدیوں کی دکھ بھری زندگی (3)

اور عدالتوں کی ناانصافیاں (4) یہ وہ برائیاں تھیں جن کے خلاف ڈکنز نے قلم اُٹھایا۔ اور معاشرتی اصلاح کے لیے باضابطہ طور پر ان برائیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ضرورت پر زور دیا۔ برائیوں کو منظر عام پر لانے کے لیے اُس نے طنز کو فنی حربہ کے طور پر استعمال کیا۔ ناول "Oliver Twist" (1838ء) میں ڈکنز نے محتاج خانوں کے بُرے انتظام و انصرام کی نشاندہی کی ہے اُس نے بتایا ہے کہ بچے کس طرح جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اس نے "Oliver Twist" کو نمونہ بنا کر تمام بچوں کی وکالت کی ہے۔ "Nicholas Nickleby" (1839ء) اور "David Copperfield" (1850ء) میں ڈکنز نے سکولوں میں تعلیم کے نظام کا مشاہدہ کیا ہے اور Sqeers اور Creakle جیسے سخت دل اساتذہ پر طنز کیا ہے۔ ناول "Little Dorrit" (1857ء) میں مصنف نے قرض داروں کی جیلوں اور قیدیوں کی قابلِ رحم حالت کو واضح کیا ہے جہاں اُنہیں دُکھ بھری زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔ اس نے جیلوں اور قیدیوں کی حالت کو بہتر بنانے کی تجاویز دی ہیں۔ ناول "Bleak House" (1853ء) میں وہ عدالتی نظام پر طنز کرتا ہے اور مقدمات کو طول دینے کی بجائے جلد انصاف مہیا کرنے پر زور دیتا ہے۔ "Hard Times" (1854ء) میں مصنف نے صنعت کاروں کی دولت سے محبت کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ "Dombey and Son" (1848ء) میں مصنف ماوی زندگی کے ایک اور پہلو کو منظر عام پر لایا ہے جسے دولت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا غرور کہا جا سکتا ہے۔ ڈکنز نے اپنے دور کی سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور صنعتی زندگی کی کمزوریوں پر طنز کیا ہے۔ معاشرتی اصلاح کے بارے میں اس کی تجاویز پر عمل درآمد کرنے میں بہت عرصہ صرف ہوا۔

Charles Eliot Norton, Philip Collins کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ''کوئی آدمی پہلے پہل مسٹر ڈکنز کے متعلق ایک مصنف کے طور پر غور نہیں کرتا وہ اپنی کتابوں میں سے ایک دوست لگتا ہے...... وہ ہمارے گھرانے کا فرد محسوس ہوتا ہے...... وہ ہمیں خوش دلی سے کرسمس منانے میں مدد دیتا ہے...... وہ ایک بڑے معاشرے کا ایسا فرد ہے جس نے اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لیے ادب کو ایک

ذریعہ بنایا ہے...... وہ ہمارے دور کا بہت بڑا جادوگر ہے اس کے جادو
کی چھڑی کتاب ہے ...... یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس فائدہ
پہنچانے والے دانا کے ہم عصر ہیں۔‘‘(5)

ڈکنز کو مزاح والم کا ماہر کہا گیا ہے اس کے ناولوں میں ہنسی اور دکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں غم و دکھ ڈکنز کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا یہی وجہ ہے کہ غم انگیز مواقع اور غمگین کردار قاری پر اس قدر گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں ہو جاتی ہے۔ڈکنز کے ناولوں میں غمگین صورتحال کی عکاسی مختلف انداز میں کی گئی ہے۔کہیں تو یہ بچوں کی دکھی اور ناخوشگوار قسمت کے ذریعہ، کہیں ان کی اموات کے ذریعہ اور کہیں فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور قیدیوں کی دلگداز حالتوں کے ذریعہ پیش کی گئی ہے۔

معصوم David پر اُس کے سوتیلے باپ کے مظالم ہیبت ناک ہیں(6)۔یہی حالت Little Nell کی ہے جو اپنے داد کے ساتھ قبرستانوں اور دیہاتوں میں آوارہ پھر رہی ہے Oliver Twist(7) بھی اسی ظالمانہ ماحول میں پرورش پاتا ہے۔Paul Dombey کی موت انتہائی دردناک ہے (8) ڈکنز کے ناولوں میں بچوں پر ہونے والے مظالم کی عکاسی مختلف انداز میں کی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈکنز کو اپنی ابتدائی زندگی کا ناقابلِ فراموش تجربہ ہمیشہ کے لیے یاد رہا اُس کی زندگی کے اسی دکھ بھرے دور نے اس کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا یہاں تک کہ مشکلات بالآخر ختم ہوگئیں تب بھی وہ انہیں کبھی نہیں بھولا۔یہی مدہم یادداشت اُس کی زندگی کی قطعی کامیابی کا درپردہ مرکز ومحور ہے۔اس بات نے اُس کے اندر کئی گُنا لوگوں کے لیے سخاوت کے جذبے کو اُجاگر کر دیا اور یوں اُس کے ناول انسان دوستی کا مظہر بن گئے۔

’’حقیقت میں ڈکنز کے ناولوں کا جامع مفہوم اسی جملے میں مکمل موجود
ہے۔لیکن اسے عقل مند لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اچھے بنو اور پیار ومحبت
سے رہو۔صحیح خوشی صرف دلی جذبات میں ہے، معقولیت اور ہمدردی
سے انسان عبارت ہے، سائنس عقلمندوں کے لیے چھوڑ دو، غرور بڑے

> آدمیوں کے لیے، عیش و عشرت اُمرا کے لیے، پست بدبختی پر ترس کھاؤ۔ سب سے چھوٹے اور نفرت کا شکار ہونے والے ہزاروں طاقتور اور مغرور افراد سے قدر و قیمت میں برابر ہو سکتے ہیں، نفیس روحوں کو مجروح کرنے سے پرہیز کرو جو تمام حالات میں اور تمام زمانوں میں پھلتی پھولتی ہیں، یقین رکھو کہ انسانیت، رحم، جان پہچان، وسعتِ قلب، نرمی اور آنسو دُنیا میں سب سے زیادہ میٹھی چیزیں ہیں۔ صرف زندہ رہنا کچھ نہیں ...... مفید ہونا بھی کافی نہیں۔ وہ صرف ایک ہی حالت میں زندہ ہے اور آدمی کہلانے کا مستحق ہے جو ایک رحم والے عمل کو یاد کر کے رو پڑا۔'' (9)

انسان دوستی سے سرشار ڈکنز نے ظلم اور استحصال کو کھول کھول کر بیان کیا ہے تاکہ ممکنہ اصلاحات کی جا سکیں۔ اس کے ناولوں میں عملی فائدوں کے باوجود اس کا تلخ اور کھچا کھچا موڈ محسوس ہوتا ہے جیسا کہ کھلے بندوں برائیوں اور برے لوگوں پر حملہ کرنے کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے۔ ڈکنز نے انسانی زندگی میں توازن قائم کیا اور صحت بخش نظام کی نشاندہی کی تاکہ متناسب اقدارِ انسانی کو اُجاگر کر کے مقصدِ حیات کی تکمیل ہو۔ اس نفسیاتی عمل کا پرجوش حملہ ڈکنز نے اُن ذہنوں پر کیا جو اقتصادیات کے ماہرین کے انفرادی نظریہ کی معاونت کرتے تھے اور اسی وجہ سے ڈکنز کی بحیثیت ناول نگار تنقید کی زَد میں رائج اصول کی اخلاقی بنیادیں لرز گئیں۔ ڈکنز نے روایتی انا پرستی کو کمزور کر دیا۔ اس نقطہ پر اس کی تعلیمات کارلائل اور رسکن کی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ (10)

ڈکنز انگلینڈ کے لوگوں کے مزاج کو بخوبی سمجھتا ہے اس نے اس کی عکاسی نہایت واضح طور پر کی ہے۔ ڈکنز نے اپنے کرداروں میں ہمدردی کا اظہار، مزاح کی مسکراہٹ اور مہربان دل کی مسرت دکھائی ہے معاشرتی دنیا کی تصویر کشی جو اس نے کی ہے ادب میں اعلیٰ مقام کی حامل ہے۔

ڈکنز انسانی زندگی کو دو اُلٹ صورتوں میں پاتا ہے۔ لوگوں کا ایک طبقہ اپنی بالا دستی میں نمایاں ہے اور دوسرا طبقہ غربت اور پس ماندگی کا شکار ہے۔ پہلا طبقہ دوسرے طبقے پر ظلم ڈھاتا رہتا ہے اور اس کا ہر

وقت اور ہر جگہ استحصال کرتا ہے۔ معاشرتی نا انصافی کا شعور ڈکنز کا تصورِ حیات ہے۔ ڈکنز کا یہ تصور محض خیالی نہیں بلکہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اس کے عملی تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

''وہ سرمایہ دارانہ صنعت کاری کا مسلسل مخالف رہا۔ اُس کی تخلیق کردہ ہر کتاب نہ صرف زندگی کی سچی دولت سے لبریز ہے بلکہ یہ ظلم اور خود غرضی کی قوتوں پر کاری ضرب ہے۔''(11)

ڈکنز انسان دوست ادیب ہے وہ مردوں، عورتوں اور بچوں سے اُن کی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود اُن سے محبت کرتا تھا۔

شوکت صدیقی نے ایسا ادب تخلیق کیا جو اُنہیں ترقی پسند مصنفین کی صف میں شمار کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں جرائم پیشہ افراد کی عکاسی کی ہے۔ غریب مزارعوں کو سرمایہ داروں اور زمینداروں کے ظلم کا نشانہ بنتے دکھایا ہے۔ ظلم کی بھٹی میں سلگتے ہوئے افراد کی حالتِ زار پیش کرنا شوکت صدیقی کا مطمعِ نظر ہے۔ وہ ظلم کے بھیانک رخ کو دکھا کر عوام کے دلوں میں ظالموں کے خلاف نفرت پیدا کراتے ہیں اور مظلوموں کی حالت کو بہتر بنانے کے خواہاں ہیں۔ شوکت صدیقی معاشرے کے وہ پہلو منظرِ عام پر لائے ہیں جنہیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اُن کے افسانوں اور ناولوں میں موجود دنیا ہمارے معاشرے کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتی ہے۔ یہ متحرک تصویریں قاری کی آنکھوں پر پڑی ہوئی پٹی ہٹا کر اُسے زندگی کے تلخ حقائق سے روشناس کراتی ہیں۔ اُن کے ناولوں ''خدا کی بستی''، ''کمین گاہ'' اور ''جانگلوس'' میں اُمرا کے مظالم منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

''جدید پاکستان میں شوکت صدیقی ان چند مصنفین میں سے ایک ہیں جن میں زندگی کے حقائق کو بیان کرنے کی جرأت موجود ہے۔''(12)

شوکت صدیقی کے ناولوں میں بھی دو طبقات نمایاں طور پر منظرِ عام پر آئے ہیں ایک ظالم طبقہ اور دوسرا مظلوم طبقہ۔ ظالم طبقہ ظلم و بربریت کی انتہائی حد پھلانگ جاتا ہے۔ ناولٹ ''کمین گاہ'' میں ترلوک چند کے مظالم کی طویل فہرست ہے۔ وہ رام بلی کو مجرمانہ زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔ اپنے منیجر نربدا رائے کو قتل کر دیتا ہے۔ اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی پر قاتلانہ حملے کی کوشش کرتا ہے۔ مزدور یونین کے

دفتر کو رام بلی کے ذریعہ آگ لگوا دیتا ہے اور آخر میں رام بلی کو بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دیتا ہے۔

ناول ''خدا کی بستی'' میں بہت سے ایسے مناظر ہیں جو دکھ اور غم سے لبریز ہیں۔ نیاز کے ذریعہ نوشا کی ماں ''رضیہ'' کا قتل ہیبت ناک اور تکلیف دہ ہے۔ عبداللہ جاوید لکھتے ہیں۔

> ''سلطانہ کی ماں کے کردار کی تخلیق میں انسانیت کے درد کی آمیزش کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ شاید ڈکنز کے علاوہ اور کسی ناول نگار کے ہاں نہ مل سکے''۔ (13)

نیاز نوشا کے پورے گھرانے کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ وہ معصوم انو کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ نوشا بھی نیاز ہی کی وجہ سے بے راہ روی کا شکار ہوتا ہے۔ نیاز کی سوتیلی بیٹی سلطانہ اس کی داشتہ کہلاتی ہے۔ نوشا کو نیاز کے قتل کے بدلے میں چودہ سال قید با مشقت کی سزا ملتی ہے۔ اس معصوم کا بچپن گمراہیوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ نوشا کے ساتھیوں راجہ اور شامی کا انجام بھی انتہائی دردناک ہوتا ہے۔ راجہ کو کوڑھ کی بیماری لگ جاتی ہے۔ شامی رکشہ چلا چلا کر ٹی بی کا مریض بن جاتا ہے۔ ان بے آسرا بچوں کی قسمت میں محرومیاں اور تکلیفیں لکھ دی گئی ہیں۔ وہ ساری زندگی سکون کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور بالآخر اندھیری وادیوں میں کھو جاتے ہیں اُن کا بچپن تاریکیوں اور ظلمات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنے مضمون ''اردو ناول کا چارلس ڈکنز'' میں ناول ''خدا کی بستی'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''اُن کے اس ناول کو پڑھ کر بے اختیار انگریزی ناول نگار چارلس ڈکنز یاد آجاتا ہے۔ جو معاشرہ کے مظالم، جابر، منافق اور ریاکار کرداروں کی عکاسی میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اُس نے بچوں پر ہونے والے ظلم کے حوالے سے سب کو بے نقاب کیا یہ اُس کے ناولوں ہی کا اعجاز تھا کہ انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے قوانین بنائے''۔ (14)

شوکت صدیقی کے ناولوں میں پیش کی گئی سماج کی جھلکیاں قاری کے علم میں اضافہ کرتی ہیں۔ صدیقی کے ناول جانگلوس میں ناول کا ہیرو ''لالی'' میاں حیات محمد وٹو کے ہاں قیام کے دوران اُس کی گھناؤنی زندگی سے پردہ ہٹاتا ہے اور اس کی ایک ایک خامی کو عیاں کرتا ہے۔ جاگیردارانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کس کس طرح ظلم کرتے ہیں جائیداد ہتھیانے کے لیے وہ اپنے سگے بھائیوں پر ظلم روا رکھنا جائز سمجھتے ہیں نہ صرف بھائیوں پر ظلم بلکہ اپنی بیویوں کو دوسروں کی خوابگاہوں کی زینت بنانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ لیکن قانون ایسے لوگوں کے کرتوت فراموش کر دیتا ہے۔ اُن سے پوچھ گچھ کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی زُعم میں جرم پر جرم کیئے جاتے ہیں۔

> ''میاں حیات محمد وٹو جب لالی سے کہتا ہے۔''تو یہاں کے کئی راز جانتا ہے میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میرے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کرے'' لالی جواب دیتا ہے''ساب کون سا کنون اور کیسا کنون؟ ...... کنون تو میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لیے ہے۔ میں تین بار جیل کاٹ چکا ہوں میں نے تو کسی وڈے آدمی کو اپنی طرح جیل کاٹتے نہیں دیکھا۔ آپ کنون شنون سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''(15)
>
> (ص:186)

ڈاکٹر حنیف فوق ''جانگلوس'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''اس ناول کی تحریر میں بھی سماجی حقیقت نگاری ان کے پیشِ نظر رہی ہے۔ لیکن اسے انہوں نے محض فارمولا نہیں بنایا ہے۔ اور نہ حقیقت کو ایک ہی سطح سے پیش کیا ہے۔ شوکت صدیقی نے دوستووسکی کی طرح بدی کے عناصر، ماحول کے اثرات اور وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے کرداروں کی پوری طرح تصویر کشی کی ہے وہ باطنی زندگی یا حسرتِ ماضی کی جگہ کوائفِ حال کو موضوع بناتے ہیں۔ دیہاتی زندگی پر مبنی ہوتے

ہوئے بھی اُن کا ناول صرف حال کی زندگی تک محدود نہیں رہتا بلکہ بدی، ظلم، تضاد اور شقاوت کا لازمانی اور موثر اظہار بن جاتا ہے۔''(16)

شوکت صدیقی ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جہاں مظلوم کو ظالم سے نجات مل سکے۔ جہاں غریب کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے جہاں حق دار اپنے حق کے لیے آواز بلند کر سکے۔ وہ ظلم و بربریت کی بجائے امن وامان کے خواہاں ہیں لیکن شوکت صدیقی کے ناولوں میں ظلم وستم کے شکار افراد کی نجات کے بارے میں وہ مکمل یقین اور اعتماد ناپید ہے جو ڈکنز کی ناول نگاری کا ماحصل ہے۔

صدیقی نے ظلم کی چکی میں پسنے والے افراد کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ معاشرے کے ان مظلوم افراد کی قسمت شروع سے آخر تک اَلم ناک دکھائی گئی ہے اُنھیں اپنی محنت کا پورا پورا صلہ نہیں ملتا وہ جاگیرداروں اور صنعت کاروں کے ظلم کو بے زبان جانور کی طرح برداشت کرتے ہیں اگر کبھی وہ اس ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو اُنھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے یا پھر اس قابل ہی نہیں رکھا جاتا کہ وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے آواز بلند کر سکیں۔ شوکت صدیقی کا تصورِ حیات سلمان کی گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے۔

''آپ بند کمروں میں بیٹھ کر زندگی کو کتابوں میں تلاش کرتے ہیں اور میں نے زندگی کو قحبہ خانوں میں دیکھا ہے۔ جھگیوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں دیکھا ہے۔ مسلسل فاقے کئے ہیں ذلتیں برداشت کی ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد تجربہ حاصل کیا ہے۔ زندگی کو برہنہ آنکھ سے دیکھئے وہ کس قدر مظلوم ہے۔''(17)

(ص:164)

ادیب سہیل ناول ''خدا کی بستی'' کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''خدا کی بستی اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا ناول ہے جس میں غربت کی لکیر سے نیچے (Below Poverty Line) کا معاشرہ ہے جس میں لاکھوں افراد کھولیوں، جھگیوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح

زندگی بسر کرتے ہیں۔شہری سہولیات سے یکسر محروم ہیں......جھگیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔اور اس میں رہنے بسنے والے لوگ غریب سے غریب تر ہوئے جاتے ہیں۔غریب غربت کی انتہائی حد پھلانگتا جاتا ہے اور صاحبِ زر مالدار سے مالدار ہوتا چلا جاتا ہے۔ملکی معیشت مٹھی بھر افراد کے رحم وکرم پر ہے اور معاشرے کا یہ تضاد جرائم کی پرورش گاہ بنا ہوا ہے۔شوکت صدیقی نے جرائم کی اس پرورش گاہ کا پردہ فاش کرنے اور اسے آئینہ دکھلانے کی اپنی سی کوشش کی ہے اور کرتے چلے آرہے ہیں۔اس معاملے میں ان کی کمٹ منٹ میں نہ کوئی فرق آیا ہے اور نہ انحراف کی شکل رونما ہوئی ہے۔شوکت صدیقی نظریاتی اور تخلیقی سفر میں زمانے کی ہوا کے نہیں ہورہے اُنہوں نے زمانے کو اپنی نظر سے دیکھا اور اپنے ہی نقطۂ نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔''(18)

شوکت صدیقی نے ڈکنز کی طرح معاشرے کے مظلوم افراد کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اُنہوں نے عوام کی توجہ اُن حقائق کی طرف مبذول کرائی ہے جنہیں عموماً لوگ نظر انداز کردیتے ہیں۔شوکت صدیقی کی ناول نگاری کا مقصود بہبودِ انسانی ہے وہ استحصال اور ناانصافی کو معاشرے کے لئے مُضر تصور کرتے ہیں شوکت صدیقی کے نزدیک ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کی گمراہیوں اور مجرمانہ ذہنیت کا سبب اعلیٰ طبقہ کی بے حسی ظلم و جبر اور حد سے بڑھی ہوئی ناانصافیاں ہیں۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دونوں معاشرتی ناول نگار ہیں۔دونوں نے اپنے گردو پیش میں موجود زندگی کے اَلم انگیز پہلوؤں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔دونوں نے زندگی کی حقیقتوں کو آرٹ کے دبیز پردوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔دونوں ہی اس لازوال قوت کے علم بردار ہیں جو اَزل سے غم و آلام کو کم کرنا اپنا مقصدِ حیات تصور کرتی ہے۔دونوں کا مقصود بہبودِ انسانی ہے۔جہالت، غربت اور بے روزگاری دونوں کے نزدیک تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اِس تمام مماثلت کے باوجود ڈکنز کو صدیقی اور صدیقی کو ڈکنز نہیں کہا جاسکتا۔صرف اس لیے نہیں

کہ دونوں علیحدہ علیحدہ انسان تھے...... یا صرف اِس لیے کہ دونوں ہی علیحدہ علیحدہ انسان تھے! ڈکنز نہ صرف انفرادی احساسات، محسوسات اور خیالات کی بنا پر بلکہ اِن انتہائی انفرادی حالات و واقعات کی بنا پر جو قدرت نے صرف اور صرف اُسی کے مقدر میں لکھے تھے، ایک انتہائی جداگانہ، انفرادی، الگ تھلگ اور مخصوص نظریاتی شخصیت کا حامل تھا۔ کم و بیش یہی الفاظ صدیقی کی اپنی مخصوص نظریاتی شخصیت کی توجیح کے طور پر استعمال کیئے جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی انسان کوئی دوسرا انسان نہیں ہوسکتا اگر ایسا ہوتا تو وہ اس دنیا میں نہ ہوتا۔ اس دنیا میں اُس کی موجودگی ہی اُس کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا ایک خاص حد کے بعد ڈکنز اور صدیقی علیحدہ علیحدہ، انفرادی شخصیت کے طور پر واضح نظر آتے ہیں دونوں کا تصورِ حیات ایک خاص نقطہ کے بعد جُداگانہ نظر آتا ہے۔ دونوں ادیب سماجی نقاد تو ہیں ہی لیکن دونوں کی مجموعی سماجی زندگی کے انجام کے بارے میں آراء اور قیاس آرائیوں میں گہرا فرق ہے۔

ہر علاقے اور ہر دور کا اپنا مخصوص ادبی کلچر اور روایت ہوتی ہے۔ ہر ادیب کا اس روایت میں اپنا مخصوص مقام ہوتا ہے اگر چہ ڈکنز اور صدیقی کا نظریۂ حیات آپس میں گہری مماثلت رکھتا ہے پھر بھی دونوں اپنے اپنے ادبی کلچر میں ایک مخصوص حیثیت کے حامل ہیں۔ آپس میں مماثلت کے باوجود دونوں کا علیحدہ علیحدہ ادبی کلچر اور روایت دونوں ادیبوں کو اپنا اپنا انفرادی مزاج اور فکر کا کسی حد تک جداگانہ انداز عطا کرتا ہے۔ یعنی دونوں ادیب سماجی نقاد تو ہیں ہی لیکن دونوں کی مجموعی انسانی زندگی کے انجام کے بارے میں آراء اور قیاس آرائیوں میں گہرا فرق ہے۔ یہ فرق دونوں کو اپنے اپنے علاقائی، ادبی اور سماجی کلچر کی طرف سے ورثے میں ملا ہے۔

ڈکنز جس دور میں پیدا ہوا اور جس دور میں اُس کی فکر پروان چڑھی وہ دور جدید انسانی علوم وفنون کی شروعات اور مذہبی و مافوق الفطرت توہمات کے اختتام کا دور تھا انسان اپنے اور کائنات کے اندر موجود اَن گنت امکانات سے آگاہ ہو رہا تھا (19) لہٰذا سماجی برائیوں اور انسانی ظلم وستم کے باوجود انسان تاریخ میں پہلی مرتبہ اُمید اور یقین کی لازوال دولت سے روشناس ہو رہا تھا۔ عہد وکٹوریہ (1837-1901) سماجی اونچ نیچ اور ظلم و جبر کا نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی سوچ کی تبدیلی اور مستقبل کی خوشی کا بھی علمبردار ہے۔ ڈکنز پر اپنے علاقے کی مجموعی سوچ کا اثر انداز ہونا بعید از قیاس بات نہیں۔ ڈکنز کا یہی

علاقائی اندازِ فکر اُسے صدیقی کے نظریۂ حیات سے ممتاز کرتا ہے۔

عہدِ وکٹوریہ (1837-1901) کی منطقی Optimism اور اُمید ہمیں ڈکنز کے ناولوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہی Optimism ڈکنز کے نالوں میں Backbone کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈکنز سماجی ظلم و ستم کی عکاسی اس یقین کے ساتھ کرتا ہے کہ مستقبل قریب میں یہ ماضی کی کہانی بن جائے گی یہ یقین شوکت صدیقی کے ناولوں میں مکمل طور پر مفقود ہے۔

شوکت صدیقی کا نظریۂ حیات اُس کے دور کی پیداوار ہے۔ صدیقی نے جس دور میں اور جس علاقے میں ادب تخلیق کیا وہ علاقہ جدید علوم وفنون سے عاری لوگوں کی آماجگاہ تھا (20)۔ قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے فوراً بعد کے برصغیر میں انسانی زندگی تذلیل کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی اور انسانی سوچ کی کوئی سمت اور منزل نہیں تھی۔ سماجی ظلم و جبر کی وجہ سے Pessimism اور مایوسی کا پیدا ہونا ایک یقینی اَمر تھا۔ صدیقی بھی اپنی تخلیقات کو اس اجتماعی سماجی فکر سے محفوظ نہ رکھ سکا اور اپنے فن پاروں میں وہ توازن پیدا نہ کر سکا جو ڈکنز اور شیکسپیئر کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔

ڈکنز کے ناولوں میں یقین، اعتماد اور اُمید کی فضا نظر آتی ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں معاشرتی برائیوں کو اس یقین کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ یہ برائیاں صرف اور صرف ختم ہونے کے لیے ہیں اور بالآخر سچائی اور اچھائی ان کی جگہ لے لے گی۔ چارلس ڈکنز نے تین اپریل 1844ء کو J.V. Staples کے نام ایک خط میں لکھا۔

> ''مجھے غریبوں پر بڑا بھروسہ ہے میں اپنی ممکنہ بہترین اہلیت سے کوشش کرتا ہوں کہ اُنہیں اُمراء کے سامنے پسندیدہ صورت میں دکھاؤں اور ایسا کرنے سے میں کبھی باز نہیں آؤں گا۔ مجھے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک یہی اُمید ہے کہ میں اُن کے حالات کے پس منظر میں اُنہیں خوش کرنے اور عقلمند بنانے کی وکالت کرتا رہوں گا۔'' (21)

ملکہ وکٹوریہ (1819-1901) ڈکنز کی وفات پر لکھتی ہیں۔

> ''اُس کی موت بہت بڑا سانحہ ہے۔ وہ محبت میں فراخ دل تھا

اور غریب طبقوں سے بہت زیادہ ہمدردی رکھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وقت
گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات میں بہتر احساس، جذبہ اور باہمی
ربط پیدا ہو جائے گا اور میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ ایسا ہو۔'' (22)

ڈکنز کے ناولوں میں Tragic Waste تو ہوتا ہی ہے لیکن آخر میں اچھائی برائی کو ختم کر کے اُس کی جگہ لے لیتی ہے۔ ڈکنز کو یہ یقین ہے کہ برائی ختم ہونے کے لیے ہے اور ختم ہو کر رہتی ہے۔ قاری کو پورے ناول کے دوران ایک خاص قسم کا سکون، اطمینان اور طمانیت کا احساس رہتا ہے اس کا دل ہمہ وقت اس یقین کے ساتھ لبریز رہتا ہے کہ آخر میں فتح سچ کی ہوگی۔ یہ یقین اُسے عملی زندگی کی تکالیف سے یکسر باہر نکال لاتا ہے اور ایک ناقابلِ بیان آسودگی فراہم کرتا ہے یہ آسودگی ہی دراصل اُس کا کیتھارسس کرتی ہے اور قاری زندگی کی تکالیف کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈکنز کے ناول المیہ نہیں بلکہ Melodrama طرز کی کہانی ہوتے ہیں جن میں وقتی تکالیف، غم و آلام کے ساتھ ساتھ، وقتی خوشی اور مستقل اُمید بھی پائی جاتی ہے جو ناول کے آخر میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ کسی بھی کہانی جس کا اختتام اُمید سے عاری نہ ہو مکمل Tragedy نہیں کہا جا سکتا۔ کہانی کے آخر میں پائی جانے والی اُمید دراصل انسانی نیکی کی بقا کی دلیل ہوتی ہے اور یہ کسی بھی کہانی کو Tragedy بنانے سے روکتی ہے ڈکنز کے تقریباً ہر ناول کا اختتام اُمید اور خوشی پر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس ہمیں شوکت صدیقی کے ہاں معاشرتی غم و آلام کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان میں ایک صحت مند تبدیلی کی خواہش تو نظر آتی ہے لیکن وہ یقین، اعتماد اور اُمید کی فضا کہیں نظر نہیں آتی جو ڈکنز کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔ قاری اس طمانیت اور سکون کے احساس سے محروم رہتا ہے جو اُسے ڈکنز کے ناول پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔ قاری کا دل مسلسل کڑھتا رہتا ہے اور طبیعت پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی ہے۔ کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قاری پر بے دلی اور خوف کی پرچھائیاں بھی مسلسل بڑھتی رہتی ہیں اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اُسے وہ ذہنی آسودگی حاصل نہیں ہوتی جو اُس کا کیتھارسس کر سکے۔

ڈکنز کے ہاں ہمیں برائی اور اچھائی کے درمیان توازن نظر آتا ہے اپنے ہاں ان دو قوتوں کو

متوازن رکھنے کے لیے ڈکنز Poetic Lisence کی تکنیک کو استعمال کرتا ہے۔ ڈکنز کی دنیا میں اچھائی کا صلہ اچھائی اور برائی کا صلہ برائی ہے۔ یہ اندازِ فکر ہمیں صدیقی کے ناولوں میں مفقود نظر آتا ہے۔ اس کی دنیا میں اچھائی کا صلہ برائی ہے۔ طاقتور ہمیشہ کمزور کو کھا جاتا ہے۔ اور کمزور ہمیشہ کمزور ہی رہتا ہے۔ صدیقی کے نزدیک Poetic Lisence محض ایک غیر مرئی، غیر حقیقی اور غیر اہم سی شے بن کر رہ جاتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کا بغور جائزہ دونوں کے منفرد اندازِ فکر کا عکاس ہے ڈکنز کے ناولوں کے ٹائٹل ہی اپنے اندر ایک مخصوص رجائیت (Optimism) سموئے ہوئے ہیں۔

Our Mutual Friend, A Tale of Two Cities, Great Expectations

قاری کے ذہن کو خاص اور غیر مرئی طمانیت بخشتے ہیں۔ ڈکنز کے دوسرے ناولوں کے ٹائٹل اگر چہ رجائیت کے علمبردار نظر نہیں آتے تو ان میں قنوطیت کا پہلو بھی مفقود ہے۔ یعنی وہ غیر جانبدارانہ حد تک کسی بھی قسم کے احساس سے عاری نظر آتے ہیں کیونکہ وہ اکثر اوقات ناول کے ہیروز کے نام ہوتے ہیں۔

Oliver Twist, David Copperfield, Nicholas Nickleby, Little Dorrit, Pickwick Papers, Dombey and Son, Martin Chuzzlewit,The Mystery of__ Edwin Drood

ناولوں کے اہم ترین کرداروں کے نام ہیں اور ان ناولوں کو پڑھے بغیر قاری کسی بھی قسم کے جذبات ان کے ٹائٹل کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتا۔ ڈکنز کی یہ خوبی بھی اسے صدیقی کے تصورِ حیات سے ممتاز کرتی ہے۔ یعنی شوکت صدیقی کی خاص یاسیت سے لبریز سوچ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا اظہار اُس کے ناولوں کے ٹائٹل میں کرتی نظر آتی ہے۔ ٹائٹل ''خدا کی بستی'' اپنے اندر طنز و تحقیر کے نشتر چھپائے ہوئے ہے۔ قاری کا ذہن خدا کی عظمت اور بستی کے چھوٹے پن میں موجود تضاد میں چھپے ہوئے مخصوص معنی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ ''خدا'' کا لفظ ''بستی'' کے ساتھ استعمال قاری کو حیرت میں ڈال کر اُس میں چھپی قنوطیت تک پہنچانے میں اُس کی مدد کرتا ہے۔ ٹائٹل ''خدا کی بستی'' اپنے اندر جو محسوسات سمائے ہوئے ہے ڈکنز کا سخت سے سخت ٹائٹل "Hard Times" بھی انہیں ادا کرنے سے قاصر ہے۔

ناولٹ ''کمین گاہ'' کا ٹائٹل جنگل کے قانون کی یاد تازہ کرتا ہے۔ قاری کا ذہن ٹائٹل کو دیکھ کر ہی مخصوص Connotations قائم کر لیتا ہے۔ شکاری، شکار اور موت کی مثلث ''کمین گاہ'' کا ایک منطقی نعم البدل بن کر قاری کے ذہن میں اُبھر آتی ہے اور یاسیت کے دبیز سائے گہرے ہو جاتے ہیں۔

ٹائٹل ''چار دیواری'' حفاظت کے احساس کی بجائے جدید قاری کے ذہن میں گھٹن، تنگی اور غلامی کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ اس کا ذہن بیرونی دنیا سے کٹ کر چار دیواری کے اندر کی دنیا کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ یوں اُس کی سوچ محدود ہو جاتی ہے۔

''جانگلوس'' صدیقی کی لفظی اختراع (Coinage) ہے۔ لفظ ''جانگلو'' کے آگے صدیقی کا ''س'' قاری کے ذہن میں ''جانگلوس'' کے معنی ''جانگلو کی دنیا'' میں بدل دیتا ہے۔ قاری جونہی لفظ ''جانگلوس'' پڑھتا ہے اس کے ذہن میں ''جانگلو کی دنیا'' گونجنے لگتی ہے اور وہ شعوری طور پر اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ ناول معاشرتی ناانصافیوں کے واقعات سے اَٹا پڑا ہوگا۔

ڈکنز کے تمام ناول شروع سے آخر تک جا بجا ایسے واقعات اور مکالموں سے پُر ہیں جن میں رجائی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ ناول "Great Expectations" میں جب Mr.Jaggers, Pip کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ وہ لندن میں اُسے تعلیم دلانے کے لیے اور ایک Gentleman کی زندگی گزارنے کے لیے لینے آیا ہے تو Pip کو اپنی Gentleman بننے کی خواہش پوری ہوتی نظر آتی ہے اور Biddy کے یہ الفاظ ڈکنز کے تصورِ حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

> ''Pip تمہارے ایک خواب کو تعبیر ملنے والی ہے۔ مجھے خوشی ہوگی
> کہ تمہارے دوسرے خواب بھی تعبیر سے ہمکنار ہوں۔''(23)
>
> (P-157)

Pip خود یہ سوچتا ہے۔

> ''میرے خواب کی تعبیر ہوتی نظر آئی۔ میرے تخیل پر سنجیدہ
> حقیقت غالب آ گئی''(24)
>
> (P-146)

مسرت کے ایسے لمحات جو درج ذیل اقتباسات میں چھپے ہیں۔ صدیقی کے ناولوں میں مفقود ہیں۔

''میرا دل تیزی سے دھڑکتا رہا اور میرے کانوں میں اس قسم
کے گیت سنائی دیئے اور ہچکچائے بغیر میں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض
نہیں''۔(25)

(P-147)

ایک روشن مستقبل کا یقین جو Pip نے محسوس کیا صدیقی کے کسی ناول میں نہیں پایا جاتا۔

''جب میں اپنے چھوٹے کمرے میں آیا میں بیٹھ گیا اور اس پر
بھرپور نگاہ ڈالی، کہ یہ ایک گھٹیا چھوٹا کمرہ ہے جس سے میں بہت جلد نجات
حاصل کرلوں گا اور ہمیشہ کے لیے بلند تر ہو جاؤں گا''۔(26)

(P-154)

لندن میں Pip کی Herbert Pocket کے ساتھ پُرسکون اور آرام دِہ زندگی شوکت صدیقی کے تصورِ حیات میں کہیں صادِق نہیں آتی لہٰذا صدیقی کے ناولوں میں اس جیسی کسی Episode کو تلاش کرنا عبث ہے۔
ناول "David Copperfield" میں David اپنی آنٹی Miss Betsey کے پاس بھاگ آتا ہے۔ David کو اپنی آنٹی کے ہاں قیام کے دوران جو سکون ملتا ہے ویسا سکون ہمیں صدیقی کے ناولوں میں نظر نہیں آتا۔ David بیان کرتا ہے۔

''جب میں نہا چکا تو میری آنٹی اور Janet نے مجھے ایک قمیض
اور پاجامہ پہنایا جو Mr.Dick کی ملکیت تھے اور دو یا تین بڑی
شالوں میں لپیٹ دیا میں نہیں جانتا کہ میں کس طرح کی گٹھڑی بن گیا
لیکن میں نے اپنے آپ کو بہت گرم محسوس کیا۔ میں نے بہت زیادہ
تھکاوٹ اور غنودگی محسوس کی اور میں جلد ہی صوفے پر دوبارہ لیٹ گیا
اور مجھے نیند آگئی''۔(27)

(P-206)

Mr.Murdstone اپنے سوتیلے باپ David کے ہاں Mr.Dick اور Miss.Betsey کے خوف سے آزاد نئی اُمنگوں بھری زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

''پس میں نے نئے نام اور اپنے متعلق ہر نئی بات کے ساتھ زندگی کا آغاز کیا۔ اب چونکہ شک والی بات نہیں رہی تھی۔ میں نے کافی دنوں تک ایک ایسے شخص کی طرح محسوس کیا جو خواب دیکھ رہا ہو۔ میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ میرے لیے میری آنٹی اور Mr.Dick کی صورت میں سرپرستوں کا ایک جوڑا ہے۔ میں نے اپنے متعلق واضح طور پر کبھی بھی نہ سوچا تھا۔ دو باتیں میرے ذہن میں واضح تھیں ایک یہ کہ Blunderstone کی زندگی بہت دور ہو گئی تھی جو بہت زیادہ فاصلے کی دھند میں نظر آتی تھی اور دوسری بات یہ کہ Murdstone اور Grinby کے کارخانے میں میری گزری ہوئی زندگی پر پردہ پڑ چکا تھا۔ تب سے کسی نے اس پردہ کو نہیں اُٹھایا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے اس بیان میں لمحہ بھر کے لیے اِس پردہ کو اُٹھایا اور خوشی کے ساتھ اِس پر پردہ گرا دیا۔ اُس زندگی کی یادداشت کے ساتھ میرے لیے دُکھ کی آمیزش تھی۔ اِس قدر تکلیف اور نااُمیدی تھی کہ مجھے کبھی جرأت نہ ہوئی کہ میں اِسے پھر یاد کروں۔ کیونکہ تب ایسی زندگی گزارنا میرے نصیب میں تھا۔ ایک سال یا زیادہ سالوں یا اس سے کچھ کم عرصے تک ایسی صورتحال رہی۔ جس کا مجھے صحیح اندازہ نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایسی صورت تھی اور وہ ختم ہو گئی''۔(28)

(P-226)

Miss.Betsey کی مالی حالت خراب ہونے کے بعد Chapter نمبر 36 (جس کا ٹائٹل ہی Enthusiasm ہے) میں David نئے عزم، نئے ولولے اور یقین کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا

سامنا کرتا ہے ایسی اولوالعزمی صدیقی کے ہاں مفقود ہے۔

''میری طبیعت اب بجھ چکی تھی۔ بھدے کوٹ سے اب میں نہیں ڈرتا تھا۔ اب خوش کن بھورے رنگ والے کپڑوں کی کوئی خواہش نہ رہی تھی۔ میری پچھلی بدقسمتی کے متعلق میری سوچ مکمل بدل چکی تھی۔ جو کچھ میں نے کرنا تھا وہ اپنی آنٹی کو دکھانے کے لیے تھا کہ اُس نے ماضی میں میرے ساتھ جو اچھا سلوک کیا تھا اسے نامعقول اور ناشکر گزار (انسان) کی طرح فراموش نہیں کر دیا گیا تھا۔ جو کچھ مجھے کرنا تھا وہ یہ تھا کہ اپنے بچپن کے دنوں کے دکھوں کا مصمم ارادے اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرتے ہوئے ازالہ کروں جو کچھ مجھے کرنا تھا وہ یہ تھا کہ جنگل کے آدمی کی طرح کلہاڑی اپنے ہاتھ میں تھام لوں حتیٰ کہ Dora تک پہنچ جاؤں''۔(29)

(P-545)

Dora کی موت کے بعد David کے عزم اور حوصلے کے بارے میں Agnes کی رائے صرف اور صرف ڈکنز جیسے ادیب کے ناول میں مل سکتی ہے۔

''وہ جانتی تھی کہ میری طبیعت سے دکھ کو اچھائی میں کیسے بدلا جائے۔ وہ جانتی تھی کہ آزمائش اور جذبہ اُسے کیسے مضبوط بنا دیتا ہے۔ اُسے یقین تھا کہ غم جس سے میں گزر چکا تھا میرے ہر کام میں مجھے مضبوط اور بلند رجحان عطا کرے گا۔ وہ جو میری شہرت میں اپنی شان سمجھتی تھی اور اس میں اضافہ چاہتی تھی تو یوں وہ جانتی تھی کہ مجھے کوشش جاری رکھنی چاہیے وہ جانتی تھی کہ میرے اندر غم کمزوری نہیں بلکہ طاقت ہونا چاہیے چونکہ میرے بچپن کے دنوں نے مجھے وہی کچھ بنا دیا تھا جو کچھ میں تھا بڑی مصیبتیں مجھے اور زیادہ بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوئیں اور اِن

مصائب نے جو سبق مجھے دیا تھا میں وہی دوسروں کو سکھاؤں'' (30)

(P-857)

ناول "Oliver Twist" میں Oliver کے ساتھ Miss Maylie کے گھر میں اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور اِسے ایک مستقل پناہ میسر آجاتی ہے۔ صدیقی کے ناولوں میں اس جیسے حسین واقعات اُس کے مخصوص تصورِ حیات کی بنا پر یکسر ناپید ہیں۔ ''خدا کی بستی'' میں اگر نوشا کو ''پروفیسر کلیم اللہ'' کے گھر سکون کے چند دن میسر آتے بھی ہیں تو وہ صدیقی کے مخصوص فلسفۂ حیات کی بدولت نوشا میں نادرہ کی غیر ضروری دلچسپی (غیر ضروری اس لیے کہ اِس Episode کے بغیر بھی ایک کامیاب ناول لکھا جا سکتا تھا) کی وجہ سے صدیقی کے مخصوص زاویۂ نظر کی نذر ہو جاتے ہیں۔ صدیقی کے ہاں Rose Maylie جیسے جذبات جو وہ Oliver کے بارے میں رکھتی ہے ہمیں کہیں نظر نہیں آتے۔

> ''روز نے کہا لیکن اگر وہ بُرا بھی نکلا خیال کریں وہ کتنا چھوٹا بچہ ہے۔ یہ بھی خیال کریں کہ اُسے کبھی ماں کی محبت نہیں ملی نہ ہی گھر کا آرام وسکون اور یہ بھی کہ بُرے برتاؤ، مار پیٹ یا روٹی کی کمی نے اُسے لوگوں کے ایسے گروہ میں دھکیل دیا جنھوں نے اِسے جرم کرنے پر مجبور کر دیا۔ آنٹی، پیاری آنٹی! براہِ کرم اسے جیل کی طرف دھکیلنے سے قبل اس کے متعلق سوچیں جو کہ ہر صورت میں اُس کی اصلاح کے مواقع کی یقیناً قبر بن جائے گی۔ افسوس! جیسے تم مجھ سے محبت کرتی ہو اور جانتی ہو کہ مجھے آپ کی اچھائی اور محبت میں والدین کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن میں بھی ایسا کر سکتی تھی اور اس بچے کی طرح بے بس اور بے آسرا ہوتی اس پر آپ رحم کریں اِس سے پیشتر کہ بہت زیادہ دیر ہو جائے!'' (31)

(P-262-263)

ناول "Oliver Twist" (1838ء) کا Chapter 32

(Of the happy life oliver began to lead with his kind friends)

Oliver کی Miss Maylie کے ہاں خوشگوار زندگی کا بیان ہے۔ایسا بیان اور سکون شوکت صدیقی کی کہانیوں میں موجودنہیں ہے۔ڈکنز Nancy کے کردار کے ذریعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مجرموں میں بھی انسانیت ہوتی ہے اوراس دنیا میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو مجرموں کے جذبات واحساسات کو سمجھ سکتے ہیں اوراُن کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔Nancy کا Rose کو Oliver کے بارے میں خطرات سے آگاہ کرنا اور Rose کا Nancy کی نیک خواہشات کو سراہنا ڈکنز کے انسانی جبلی نیکی پر پختہ ایمان کی دلیل ہے۔صدیقی کے ہاں موجود لالی کا کردار اپنے مایوس کن انجام کے ساتھ صدیقی کی قنوطی سوچ کو عیاں کرتا ہے جبکہ ڈکنز کے تقریباً ہر ناول کا انجام قاری میں اُمید واطمینان کی کیفیت اُجاگر کرتا ہے جو صدیقی میں مفقود ہے۔

ناول"A Tale of Two Cities" (1859ء) میں ڈکنز نے اپنی جبلی رجائیت (Optimism) کا اظہار کیا ہے۔صدیقی کے برعکس (جس نے معاشرتی ظلم وستم کی عکاسی کی ہے) ڈکنز نے اس ناول میں اپنے اس یقین کو عملی جامہ پہنایا ہے کہ یقین اور اعتماد کے ساتھ ظلم کے خلاف جہاد کے ذریعہ ظالم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جاسکتا ہے۔غریب عوام نے جس طرح اُمراء کے خلاف منظم جدوجہد کو واضح فتح میں بدل دیا وہ ڈکنز کے واضح ،شفاف اور پُر اُمید تصورِ حیات کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات کے برعکس شوکت صدیقی کے ناول جابجا اپنے مخصوص قنوطی اندازِ فکر سے بھرے پڑے ہیں۔ناول ''خدا کی بستی'' (1957) شروع سے آخر تک قاری کے ذہن کو معمولی سا سکون مہیا کرنے پر آمادہ نہیں۔کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ قاری کی جبلی رجائیت مسلسل گھٹتی رہتی ہے۔راجہ کی ساحلِ سمندر پر خودکشی کی کوشش اور راجہ اور نوشا کے درمیاں ہونے والی گفتگو اور جسمانی جدوجہد قاری کی نظر میں زندگی کی قدرتی رنگینی کو ختم کردیتی ہے۔

''نوشا نے راجہ سے کوئی بات نہیں کی البتہ جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔لہریں بار بار اُمڈ کر گھاٹ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔اُن کے ٹکرانے سے سفید سفید جھاگ اُٹھتا۔پانی کے چھینٹے دور دور تک بکھر جاتے۔ہر بار ایسا شور اُٹھتا جیسے کوئی کراہ رہا ہو۔سسکیاں بھر رہا ہو۔

خوف سے اُس کا جسم لرز اُٹھتا۔ اِسی وقت لہروں کے شور سے راجہ کی آواز اُبھری وہ کہہ رہا تھا ''یار جی چاہتا ہے مر جاؤں''۔

نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ اُس کی گردن دیوار سے ٹکی تھی۔ آنکھیں آسمان کی جانب تھیں۔ نوشا اس کی بات سن کر کچھ اس قدر خوف زدہ ہو گیا کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا'' سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے'' نوشا نے دیکھا، اُس کا چہرہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح پیلا پڑ گیا تھا آنکھوں سے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ دیر تک روتا رہا ہے۔ راجہ نے گہری سانس بھری اور گردن جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ اُس کی ٹانگیں کھسک کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ آدھا دھڑ باہر لٹک رہا تھا نوشا نے جھپٹ کر اُسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ گھبرا کر بولا'' یار راجہ تجھے ہو کیا گیا؟''

راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نوشا کی گرفت سے خود کو چھڑانے لگا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھ گئے۔ راجہ نے خفگی سے کہا'' نوشا مجھے چھوڑ دے'' مگر نوشا باز نہ آیا۔ وہ اسے اپنی جانب گھسیٹ رہا تھا اور راجہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا اس کی دونوں ٹانگیں باہر لٹکی ہوئی زور زور سے ہل رہی تھیں۔ نیچے دریا کی لہریں اُبھر اُبھر کر گھاٹ کی دیوار سے ٹکراتیں۔ پانی اُچھل کر دور تک بکھر جاتا سطح آب پر سفید سفید جھاگ پھیل جاتا ہر بار اس طرح شور اُٹھتا جیسے کوئی کراہتے ہوئے ہائے کرے۔ لہریں ٹکراتی رہیں شور اُبھرتا رہا۔

ہائے، ہائے، ہائے!

''نوشا مجھے چھوڑ دے۔ نوشا مجھے چھوڑ دے''۔ راجہ بار بار کہہ رہا تھا اُس کی آنکھیں سُرخ پڑ گئی تھیں چہرے پر پسینے کے قطرے

بکھرے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے بال جھک کر پیشانی پر آ گئے تھے۔
اچانک راجہ نے چیخ کر کہا۔
''چھوڑ دے مجھے ورنہ تو بھی میرے ساتھ جائے گا''۔
نوشا نے کچھ کہنا چاہا۔ اسی وقت بلبلا کر راجہ نے اس کی کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ لمحہ بھر کے لیے نوشا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ راجہ نے ڈپٹ کر کہا'' ابے حرامی چھوڑ مجھے''۔ نوشا نے جلدی سے بازو پکڑ کر زور سے گھسیٹا۔ راجہ کا تمام جسم اوپر آ گیا۔
راجہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نڈھال ہو کر فرش پر گر پڑا۔ اُس کا چہرہ جھکا ہوا تھا جسے اُس نے ایک ہاتھ سے چھپا لیا تھا۔ نوشا اُس کے قریب ہی بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ گھاٹ کے شکستہ برج کے اندر آہستہ آہستہ سسکیاں اُبھرنے لگیں۔ راجہ فرش پر پڑا رو رہا تھا۔ وہ دیر تک روتا رہا۔ نوشا کھسک کر اور نزدیک ہو گیا۔ اُس کا بازو جھنجوڑ کر بولا۔
''ابے کب تک یوں عورتوں کی طرح روتا رہے گا''۔
راجہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ ہاتھ سے چھپائے سسکیاں بھرتا رہا۔ نوشا نے کہا'' آؤ اب گھر چلیں''۔ راجہ بے زاری سے بولا''نہیں یار میں کہیں نہیں جاؤں گا''۔''ابے کچھ دماغ خراب تو نہیں ہو گیا؟''۔ راجہ ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا''یار تو نے ناحق روک لیا۔ مر جاتا تو اچھا تھا۔ میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا۔ کوئی نہ روتا۔ میرا بیٹھا ہی کون ہے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن۔ کوئی بھی تو نہیں''۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا''۔(32)

(ص:94,93)

سلطانہ کی ماں ''رضیہ'' کی موت کا بیان اپنے اندر ناقابلِ بیان درد سموئے ہوئے ہے۔

''گھر کے قریب پہنچ کر سلطانہ نے دیکھا دروازہ پاٹوں پاٹ کُھلا ہے۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اُس نے سہمی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ گھر میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ ماں کے کمرے میں روشنی تھی۔ وہ سیدھی وہیں پہنچی۔ ماں تکیے پر سر رکھے خاموش پڑی تھی۔ اُس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور ایک ہاتھ پلنگ کے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ جھپاک سے قریب پہنچی۔ اُس نے ماں کا ہاتھ اُٹھایا تو دل دھک سے رہ گیا۔ اُس نے بدحواس ہو کر کہا۔ ''اماں اماں!'' ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح خاموش پڑی رہی۔ سلطانہ نے گھبرا کر ماں کے جسم کو ہلایا اور بے قرار ہو کر چیخنے لگی۔ ''اماں، اماں! میری اماں! منہ سے تو بولو'' ماں اب کیا بولتی۔ وہ تو کب کی مر چکی تھی۔ سلطانہ چیختی رہ گئی۔ اُس کو آواز دیتی رہ گئی۔ اُس نے پہنچنے میں دیر کر دی''۔(33)

(ص:251،252)

''خدا کی بستی'' میں جا بجا پُر درد مکالموں کی بھرمار ہے۔ چند ایک ذیل میں موجود ہیں۔

'' اسپتال والوں نے میری ایک ٹانگ کاٹ ڈالی اور کوڑھیوں کے اسپتال بھیج دیا۔ کئی روز تک وہاں پڑا رہا۔ مگر اسپتال میں جگہ نہیں تھی۔ ایک روز چوکیداروں نے زبردستی اُٹھا کر مجھے ایک درخت کے نیچے ڈال دیا۔ جب سے یونہی در بدر کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں''۔(34)

(ص:360)

''راجہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ اب اپنی قسمت میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے''۔(35)

(ص:402)

''یار انسانوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اب جانوروں سے بھی دوستی نہ کردں''۔(36)

(ص:403)

راجہ نوشا کو چاقو دیتا ہے''میرے پاس رہے گا تو کسی دن اپنے ہی ہاتھوں اپنا سینہ نہ چیر ڈالوں۔ یار سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ تُف ہے ایسے جینے پر''۔(37)

(ص:404)

ناول''جانگلوس''(1989) میں معاشرتی ظلم و جبر کے خلاف برسرِ پیکار لالی قاری کو آخر تک رجائیت مہیا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ پورے ناول میں وہ مصیبتوں کا شکار رہتا ہے اور آخر میں پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کے چند جملے صدیقی کی یاسیت کے عکاس ہیں۔

''میرا موسا درزی تھا۔ سلائی کی مشین بیچ کر اپنی بیٹی کے ویاہ کے لیے دوسو روپے لایا تھا۔ موسی اُس کی دوسری گھر والی تھی پہلی مرگئی تھی اور اسی کی بیٹی کا ویاہ تھا۔ میں نے موسا کے دوسو روپے جلا ڈالے تو وہ گصے سے پاگل ہوگیا۔ جلتا ہوا دیوا اُٹھا کر موسی کے منہ پر مارا۔ اُس کی ایک آنکھ جل گئی۔ اس نے اپنا گصہ مجھ پر اُتارا۔ مجھے دھکا دے کر جلتے الاؤ میں پھینک دیا۔ ماں نہ ہوتی تو جل کر مَر جاتا۔ ٹھیک ہی ہوتا۔ لالی کی آواز میں درد کی چبھن تھی۔''(38)

(ص:62)

''چھوٹا سا تھا تو ماں مرگئی ۔ بپو جیل چلا گیا۔ پتہ نہیں ، زندہ
ہے کہ مرگیا''۔ لالی افسردہ ہوگیا ''میں تو جی کوڑے کا ڈھیر ہوں۔
کوڑے کے ڈھیر پر پلا اور کوڑے کا ڈھیر ہی رہا۔ کھاد بھی نہ بن سکا۔
مگر تمہارا کھصم ۔'' لالی جھجکا پھر مسکرا کر بولا۔'' معاف کرنا جی ! میں
ایسے ہی بولتا ہوں''۔(39)

(ص:197)

ناولٹ ''کمین گاہ'' (1945) صدیقی کے خاص اندازِ فکر سے عاری نظر نہیں آتا۔ پورے ناولٹ میں رام بلی، ترلوکی چند کے آلۂ کار کے طور پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور غریب مزدوروں کا استحصال کرتا ہے پھر بھی اُس کی حیثیت ترلوکی چند کے ایک کتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ٹونی چند رام بلی سے کہتا ہے۔

''اے بات وات کچھ نہیں ۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم دونوں ہی سیٹھ
ترلوکی چند کے کتے ہیں''۔(40)

(ص:152)

آخر جب رام بلی کی ترلوکی چند کو کوئی ضرورت نہیں رہتی اور جب وہ اس کے لیے مستقل خطرہ بن جاتا ہے تو اسے پُراسرار طریقے سے ختم کر دیا جاتا ہے۔

ڈکنز اور صدیقی کے اختتامی صفحات دونوں ادیبوں کے علیحدہ علیحدہ تصورِ حیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈکنز کے تقریباً ہر ناول کا اختتام اُمید اور خوشی پر ہوتا ہے۔ چارلس ڈکنز کے نزدیک زندگی خواہشوں، ناکامیوں اور اُمیدوں کے نا ختم ہونے والے سلسلے کا نام ہے اور ہمیں انہی تین کونوں والی مثلث میں ہی انسان ابدی جدوجہد کرتا نظر آتا ہے۔ اُس کے ناول Tragedy نہیں بلکہ Melodrama طرز کی کہانی ہوتے ہیں۔ جن میں وقتی تکالیف کے ساتھ ساتھ وقتی خوشی اور مستقل اُمید بھی پائی جاتی ہے۔ ڈکنز کے برعکس صدیقی کے ناول اختتام میں یاسیت کی عروج تک پہنچ جاتے ہیں۔ ''خدا کی بستی'' میں نوشا کو چودہ سال قید با مشقت کی سزا قاری کو نوشا کے اچھے مستقبل سے نا اُمید کر دیتی ہے۔ صدیقی آخری صفحات میں خود لکھتا ہے۔

''نوشا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر جیب کترا بن گیا۔ تب وہ صرف سال بھر کے لیے جیل گیا تھا۔ اب اُسے چودہ سال کی سزا ملی تھی۔ چودہ سال کی طویل مدت میں وہ زیادہ بڑا اور خطرناک جرائم پیشہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ جرائم پیشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی۔ وہ موت چاہتا تھا۔ وہ بِلک بِلک کر پھانسی کی درخواست کر رہا تھا۔ مگر عدالت اسے دینے کے حق میں نہیں تھی۔ انصاف کا یہی تقاضا تھا''۔ (41)

(ص:480)

ناول ''جانگلوس'' میں پاگل خانے میں سلیم لودھی کی صدا ''اوئے بھول جا'' کے ساتھ ناول کے اختتامی فقرات صدیقی کے مخصوص اندازِ فکر کے عکاس ہیں۔

''لالی نے دل گرفتہ ہو کر سوچا، سلیم لودھی واقعی پاگل اور چریا ہو گیا ہے۔ اِس کی اِس صدا کا نامعلوم کیا مطلب ہے لیکن اس خود فراموشی کے عالم میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے اور صرف پاگل اور دیوانہ رہ گیا ہے۔ اسے بھی سب کچھ بھول جانا چاہیے یہ بھی بھول جانا چاہیے کہ وہ لالی ہے۔ اب وہ صرف ایک پاگل ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ جیل کے چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رہ کر اُسے سلیم لودھی کی طرح پاگل ہی بن کر رہنا ہوگا۔ یہ ایسا وارڈ ہے جس میں داخل ہونے کا تو راستہ ہے مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اِس میں قیدی بننے کے بعد کوئی رہائی پا کر نہیں نکلتا۔ اس کی لاش ہی نکلتی ہے۔

سلیم لودھی نے ایک بار پھر اونچی تان میں صدا لگائی ''اوئے بھول جا''۔ ارشاد الٰہی پر یکایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ بے قرار

ہو کر اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچ کر زور سے کھانسنے لگا۔ اس نے کھنکار کر فرش پر تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا خون کا لوتھڑا بھی نکلا۔ ارشاد الٰہی نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا''(42)۔

(ص:744)

ناولٹ ''کمین گاہ'' کا اختتامیہ قنوطی اندازِ فکر میں اپنی مثال آپ ہے۔

''اس رات کے بعد رام بلی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ چند روز بعد گوپا ندی کے کنارے جنگل میں ایک لاش پائی گئی۔ جنگلی جانوروں نے اس کا گوشت اس طور نوچ نوچ کر کھایا تھا کہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ لاش اس بری طرح مسخ ہو چکی تھی کہ پولیس نے اِسے ناقابلِ شناخت اور لاوارث قرار دے دیا۔ اس کا کریا کرم بھی لاوارثوں کی طرح کیا گیا۔ ارتھی پر ایک میلی کچیلی چادر پڑی تھی جسے چند لکڑیوں پر رکھ کر تیل چھڑکا گیا اور آگ لگا کر راکھ کر دیا گیا''۔(43)

(ص:172)

صدیقی کے برعکس ڈکنز کے تقریباً ہر ناول کا اختتام قاری کو خاص قسم کی طمانیت، سکون اور اطمینان بخشتا ہے۔ اس کے اختتامیہ صفحات قاری کو پُر امید کر دیتے ہیں۔ ناول "Great Expectations" (1860-61) کا اختتام ملاحظہ ہو۔

''جیسے کہ وہ بنچ سے اُٹھی، میں نے اُٹھتے ہوئے اور اُس پر جھکتے ہوئے کہا کہ ہم دوست ہیں۔ Estella نے کہا اور ہم دوست رہیں گے۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہم اِس کھنڈر سے باہر نکل آئے اور جیسا کہ صبح کی دُھند کافی پہلے سے اُٹھ رہی تھی جب میں نے پہلے پہل لوہار کی بھٹی کو چھوڑا تھا۔ اسی طرح شام کی دُھند پُرسکون روشنی کی وسعتوں میں اُٹھ رہی تھی۔ اُس سے جدا ہونے

کا کوئی اور سایہ میں نے پھر نہ دیکھا''۔(44)

(P-520)

ناول "David Copperfield"(1849-50) کا اختتام ناقابلِ بیان سکون اور خوشی فراہم کرتا ہے۔

''اور اب جب کہ میں اپنا کام مکمل کر چکا ہوں۔ اور اپنی خوشی کو مزید بڑھنے سے روک لیتا ہوں۔ یہ چہرے مدہم ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک چہرہ جنت کی روشنی کی طرح میرے اوپر چمک رہا ہے جس کی روشنی میں مَیں باقی تمام چیزیں دیکھتا ہوں وہ چہرہ اُن سب سے اعلیٰ ہے۔ اور اُن تمام سے منفرد ہے اور صرف وہی رہ گیا ہے۔

مَیں اپنا سر موڑتا ہوں۔ اور اسے دیکھتا ہوں۔ اُس کی پُر سکون خوبصورتی کو دیکھتا ہوں۔ میرا لیمپ دھیما دھیما روشن ہے۔ اور میں رات گئے تک لکھتا رہا ہوں لیکن اُس کی پیاری ہستی میرے ساتھ ہے جس کے بغیر میں کچھ نہ ہوتا۔

اے Agnes! او میری روح! میری زندگی کے اختتام تک تمہارا چہرہ میرے قریب رہے۔ جب حقیقتیں سایوں کی صورت میں ڈھل رہی ہوں۔ جن سے میں اب دستبردار ہو رہا ہوں، تب بھی میں تمہیں اپنے پاس دیکھوں کہ تم میری روح کو رفعتوں کی طرف مائل کر رہی ہو''۔(45)

(P-920)

ناول ''Oliver Twist''(1837-38) کا خوش کن اختتام ملاحظہ ہو۔

''میں خوشی کے ساتھ اب بھی اُن چند افراد میں رہنا چاہتا ہوں جن کے درمیان میں کافی عرصہ رہ چکا ہوں۔ اُن کی خوشی کی عکاسی کرتے

ہوئے میں اُنکی خوشی میں شریک ہوتا ہوں۔ میں Rose Maylie کو اُس کی ابتدائی نسوانیت کے جوبن اور وقار میں دکھاتا ہوں۔ جو اپنی زندگی کے تنہا راستے میں ہلکی پھلکی روشنی بکھیرتی گئی جو اُس کے ہمسفروں پر پڑی اور اُن کے دِل روشن ہو گئے...... میں اُسے اور اُس کی مری ہوئی بہن کے بچے کو باہمی محبت کے دوران میں اُن کی تصویر کشی کرتا ہوں اور تمام اوقات اُن کے دوستوں کو تصور میں لے آتا ہوں جنہیں وہ بڑے دُکھ کے ساتھ کھو بیٹھے۔ میں اپنے سامنے ایک دفعہ پھر اُن خوش کن چھوٹے چہروں کو لاتا ہوں جو اُس کے گھٹنوں کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور وہ اُن کی خوش کن باتیں سنتی۔ میں اُس صاف و شفاف مسکراہٹ کے انداز کو یاد کرتا ہوں۔ میں اُن ہمدرد نیلی آنکھوں میں چمکتے ہوئے ہمدردی کے آنسوؤں کو تصور میں لاتا ہوں۔ اور ایسی ہزاروں نظروں، مسکراہٹوں، خیال اور گفتگو کے اُتار چڑھاؤ میں سے ہر ایک کو بڑی خوشی سے یاد کرتا ہوں''۔(46)

(P-505-506)

ناول"A Tale of Two Cities"(1859)کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

''میں خوبصورت شہر اور خوش خوش لوگوں کو پستیوں میں سے اُبھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اور آزاد ہونے کے لیے اُنکی کشمکش، اُنکی فتح اور شکست، آئندہ طویل سالوں کے دوران میں مَیں اِس دور اور پچھلے دور کی خرابیاں دیکھتا ہوں جن کا پیدا ہونا فطری ہے...... میں اُن زندگیوں کو دیکھتا ہوں جن کی خاطر میں نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ جو ایسے انگلستان میں پُر اَمن، مفید، خوشحال اور خوش ہیں، جسے میں پھر نہیں دیکھ سکتا...... میں دیکھتا ہوں کہ میں اُن کے اور انکی

نسلوں کے دلوں میں مقدس حیثیت رکھتا ہوں...... میں اُسے ایک بوڑھی عورت کی صورت میں دیکھتا ہوں جو برسی کے دن میرے لیے رو رہی ہے...... یہ بہترین آرام ہے جو مجھے ملا ہے جس سے میں پہلے کبھی واقف نہ تھا''۔(47)

(P-366-367)

ڈکنز کے تقریباً تمام ناولوں کا اختتام اُمید، اور خوشی پر ہوتا ہے۔ قاری زندگی کی تلخیوں اور تکالیف سے آزاد ہوکر مستقبل کے بارے میں پُراُمید ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ڈکنز کے تمام ناولوں کی اساس ہے۔

دونوں ادیبوں کے گہرے مطالعے کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز کے نظریۂ حیات میں واضح فرق ہے۔ ڈکنز زندگی کو رجائی اندازِ نظر سے دیکھتا ہے جبکہ صدیقی کے نزدیک زندگی یاسیت سے عبارت ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ Old Curiosity Shop' Hard Times

2۔ Nciholas Nickleby' David Copperfield

3۔ Little Dorrit

4۔ Bleak House

5۔ Philip Collins (ed) "The critical Heritage" P.1,

New York Barnes and Noble INC, 1971.

"No one thinks first of Mr. Dickens as a writer. He is at once through his book, a friend ...... He is not so much the guest as the intimate of our homes ...... he helps us to celebrate Christmas with heartier cheer, ... it is as a man of the largest humanity, who has simply used literature as the means by which to bring himself into relation with his fellow men ...... He is the great magician of our time. His wand is a book ...... It is a rare piece of good fortune for us that we are the contemporaries of this benevolent genius ......".

6۔ David Copperfield

7۔ Old Curiosity Shop

8۔ Dombey and Son

9۔ Stephen Wall (ed) "Charles Dickens", P.103, Penguin Books, 1970.

In reality, the novels of Dickens can all be reduced to one phrase, to wit: Be good, and love, there is genuine joy only in the emotions of the

heart; sensibility is the whole man. Leave science to the wise, pride to the nobles, luxury to the rich, have compassion on humble wretchedness; the smallest and most despised being my in himself be worth as much as thousands of the powerful and the proud. Take care not to bruise the delicate souls which flourish in all conditions, under all costumes, in all ages.

Believe that humanity, pity, forgiveness, are the finest things in man, believe that intimacy, expansion, tenderness, tears, are the sweetest things in the world. To live is nothing, to be powerful, learned, illustrious, is little, to be useful is not enough. He alone has lived and is a man who has wept at the remembrance of a kind action which he himself has performed or received."

10۔ کارلائل اور رسکن دونوں روایتی انا پرستی کے خلاف تھے۔

11۔ A.E. Dyson (ed) "Dickens Modern Judgements", P.280, Macmillan and Co. Ltd. 1968.

"He understood it with unwavering hostility. Every book he produced was not only a celebration of the true wealth of life, it was an attack on the forces of cruelty and selfishness."

12۔ Sagaree Sengupta, Shaukat Siddiqi Pakistan's Venerable Man of letters, P.66, "Persimmon Spring New York, 2001.

"Siddiqi is one of the few writers who have had the courage to describe the realities of life in modern Pakistan."

13۔ عبداللہ جاوید ''خدا کی بستی'' ص48، ''نئی قدریں'' حیدرآباد، 1970۔

14۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر ''اردو ناول کا چارلس ڈکنز'' ص 23 مشمولہ ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی، شمارہ، مارچ، اپریل 2001۔

15۔ شوکت صدیقی، ''جانگلوس'' (جلد اول) ص186، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز 1998۔

16۔ حنیف فوق، ڈاکٹر، ''شوکت صدیقی ایک مطالعہ'' ص20، مشمولہ ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی، شمارہ، مارچ اپریل 2001۔

17۔ شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص164، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز 1995۔

18۔ ادیب سہیل، ''شوکت صدیقی اپنے فن کے آئینے میں'' ص138، 139، مشمولہ سہ ماہی ''کہکشاں'' کراچی، 2001۔

19۔ ریلوے انجن کا بننا، سٹیم انجن کی بہتری، ڈارون کے انقلابی نظریات، انگلستان کی آدھی دنیا پر حکمرانی، ملک میں دولت کی فراوانی۔ یہ تمام ایسے محرکات تھے جو انگلستان کے باسیوں کی سوچ میں ایک مخصوص ترنگ، امید اور ولولہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔

20۔ صدیقی محکوم قوم کا فرد تھا جبکہ ڈکنز حاکم قوم کا۔ لہٰذا دونوں اپنے اپنے مخصوص نفسیاتی انداز کے نمائندہ ہیں۔

21۔ Stephen Wall (ed) "Charles Dickens", P.66.

"I have great faith in the poor; to the best of my ability. I always endeavour to present them in a favourable light to the rich; and I shall never cease, I hope untill I die, to advocate their being made as happy and as wise as the circumstances of their conditions in its utmost imporvement, will admit of their becoming."

22۔ Philip Collins (ed) "The Critical Heritage" P.502.

"He is a very great loss. He had a large loving mind and the strongest sympathy with the poorer classes. He felt sure that a better

feeling, and much greater union of classes would take place in time. And I prey earnestly it may."

-23 Charles Dickens, "Great Expectation" P.157,

Oxford University Press, 1957.

"So one dream is coming true pip. I wonder if your others will too."

-24 Ibid, P.146.

"My dream was out, my mild fancy was surpassed by sober reality."

-25 Ibid, P.147.

"My heart was beating so fast, and these was such a singing in my ears, that I could scarcely stammer I had no objection."

-26 Ibid, P.154.

"When I got into my little room, I sat down and took a long look at it, as a mean little room that I should soon be parted from and raised above, for ever."

-27 Charles Dickens, "David Copperfield" P.206,

Thomas Nelson and Sons Ltd.

"When I have bathed, they (I mean my aunt and Janet) enrobed me in a shirt and a pair of trousers belonging to Mr. Dick, and tied me up in two or three great shawls. What sort of bundle I looked like, I do not know, but I felt a very hot one. Feeling also very faint and drowsy, I soon lay down on the sofa again and fell asleep."

Ibid, P.226. -28

"Thus I began my new life, in a new name, and with everything new about me. Now that the state of doubt was over I felt, for my days, like one in a dream. I never thought that I had a curious couple of guardians in my aunt and Mr. Dick. I never thought of anything about myself distinctly. The two things clearest in my mind were, that a remoteness had come upon the old. Blunderstone life which seemed to lie in the haze of an immeasureable distance, and that a curtain had for ever fallen on my life at Murdstone and Grinby's. No one has ever raised that curtain since. I have lifted it for a moment, even in this narrative, with a reluctant hand and dropped it gladly. The remembrance of that life is fraught with so much pain to me, with so much mental suffering and want of hope, that I have never had the courage even to examine how long I was doomed to lead it. Whether it lasted for a year, or more or less, I donot know. I only know that it was, and ceased to be; and that I have written and there I leave it".

Ibid, P.545. -29

"I was not dispirited now. I was not afraid of the shabby coat, and had no yearnings after gallant greys. My whole manner of thinking of our late misfortune was changed. What I had to do was, to my aunt that her past goodness to me had not been thrown away on an insensible ungrateful object. What I had to do was, to turn the painful discipline of

my younger days to account, by going to work with a resolute and steady heart. What I had to do was, to take my woodman's axe in my hand and clear my own way through the forest of difficulty, by cutting down the trees until I came to dora."

-30 Ibid, P.857.

"She knew, she said, how such a nature as mine would turn affliction to good. She knew how trial and emotion would exalt and strengthen it. She was sure that in my every purpose I should gain a firmer and a higher tendency, through the grief I had undergone. She, who so gloried in my fame and so looked forward to its augmentation, well knew that I would labour on. She knew that in me sorrow could not be weakness, but must be strength. As the endurance of my childish days had done its part to make me what I was, so greater calamities would nerve me on to be yet better than I was; and so, as they had taught me, would I teach others."

-31 Charles Dickens, "Oliver Twist", P.262, 263, Thomas Nelson and Sons Ltd.

"But even if he has been wicked", pursued Rose, "think how young he is; think that he may never have known a mother's love, or the comfort of a home, and that ill-usage and blows, or the want of bread, may have driven him to herd with men who have forced him to guilt. Aunt, dear aunt, for mercy's sake, think of this before you let them drag this sick

child to a prison, which in any case must be the grave of all his chances of amendment. Oh! as you love me, and know that I have never felt the want of parents in your goodness and affection, but that I might have done so, and might have been equally helpless and unprotected with this poor child, have pity upon him before it is too late.

32۔ شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:93،94، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز 1995ء۔

33۔ ایضاً ص:251،252۔

34۔ ایضاً ص:360۔

35۔ ایضاً ص:402۔

36۔ ایضاً ص:403۔

37۔ ایضاً ص:404۔

38۔ شوکت صدیقی، ''جانگلوس'' (جلد اول) ص:62، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز 1998ء۔

39۔ ایضاً ص:197۔

40۔ شوکت صدیقی، ''کمین گاہ'' ص:152، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز 1997ء۔

41۔ شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:480۔

42۔ شوکت صدیقی، ''جانگلوس'' (جلد سوم) ص:744۔

43۔ شوکت صدیقی، ''کمین گاہ'' ص:172۔

44۔ Charles Dickens, "Great Expectations" P.520.

"We are friends", said I, rising and bending over her, as she rose from the bench. 'And will continue friends apart' said Estella. I took her hand in mine, and we went out of the ruined place; and, as the morning mists had risen long ago when I first left the forge, so, the evening mists

were rising now, and in all the broad expanse of tranquil light they showed to me, I saw no shadow of another parting from her."

Charles Dickens, "David Copperfield", P.920. -45

"And now, as I close my task, subding my desire to linger yet, these faces fade away. But one face, shining on me like a Heavenly light by which I see all other objects, is above them and beyond them all. And that remains. I turn my head, and see it, in its beautiful serenity, beside me. My lamp burns low, and I have written far into the night; but the dear presence, without which I were nothing, bears me company. O Agnes, O my soul! so may thy face be by me when I close my life indeed; so may I, when realities are melting from me like the shadows which I now dismiss, still find thee near me, pointing upward!"

Charles Dickens,"Oliver Twist", P.505,506. -46

"I would fain linger yet with a few of those among whom I have so long moved, and share their happiness by endeavouring to depict it. I would show Rose Maylie, in all the bloom and grace of early womanhood, shedding on her secluded path in life such soft and gentle light as fell on all who trod it with her, and shone into their hearts...... I would paint her and her dead sister's child happy in their mutual love, and passing whole hours together in picturing the friends whom they had so sadly lost; I would summon before me, once again, those joyous little faces that clustered round her knee, and listen to their merry prattle; I

would recall the tones of that clear laugh, and conjure up the sympathizing tear that glistened in the soft blue eye. These, and a thousand looks and smiles, and turns of thought and speech ___ I would fain recall them every one."

47- Charles Dickens,"A Tale of Two Cities", P.366,367, Penguin Popular Classics, 1994.

"I see a beautiful city and a brilliant people rising from this abyss, and, in their strugles to be truly free, in their triumphs and defeats, through long long years to come, I see the evil of this time and of the previous time of which this is the natural birth, ... I see the lives for which I lay down my life, peaceful, useful, Prosperous and happy, in that England which I shall see no more ...... I see that I hold a sanctuary in their hearts, and in the hearts of their descendants, generations hence. I see her an old woman, weeping for me on the anniversary of this day ...... It is a far, far better thing that I do, than I have ever done; it is a far, far better rest that I go to than I have ever known."

باب چہارم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں کردار نگاری

باب چہارم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں
کردار نگاری

کردار نگاری ناول کی روح ہے۔ ناول کا پلاٹ کرداروں سے ہی تشکیل پاتا ہے۔ کردار حقیقی دنیا میں موجود حقیقی انسانوں کا عکس ہوتے ہیں چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں موجود کردار جیتی جاگتی دنیا کے انسانوں کی کس قدر عکاسی کرتے ہیں۔اس باب میں اسی بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دونوں مصنفین کی کردار نگاری کے تقابل اور فرق کا تجزیہ سابقہ ادبی تنقید کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے یہ موازنہ ذیل میں دیئے ہوئے نقاط کی وضاحت پر مشتمل ہے۔

...... سادہ(Flat)اور مکمل(Round) کردار

...... تخیل اور حقیقت کا امتزاج

...... کرداروں کا تقابل

جہاں تک چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کی کردار نگاری کا تعلق ہے دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ہمیں دونوں کے ہاں مکمل(Round) کردار نہیں ملتے کیونکہ اس کے لیے ادیب کو کرداروں کی بتدریج تبدیلی کی (ذہنی اور نفسیاتی سطح پر) توجیہہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ جو ڈکنز اور صدیقی کے ناولوں میں مفقود ہے۔

کردار نگاری کی بجائے وہ ناول کی بیانیہ تکنیک (Narrative Technique) پر زیادہ زور دیتے ہیں گو کہ ہمیں دونوں ناول نگاروں کے ہاں مکالمہ نظر آتا ہے لیکن صرف مکالمہ کردار نگاری کو جنم نہیں دے سکتا۔

E.M.Forster نے کرداروں کو دو اقسام سادہ(Flat) اور مکمل(Round) میں تقسیم کیا ہے۔ سادہ کرداروں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ اگر ایسے کرداروں میں ذرہ برابر

بھی تبدیلی محسوس ہوتی ہے تو وہ مصنف کی طرف سے زبردستی عائد کردہ ہوتی ہے۔ مکمل کردار سادہ کردار سے قطعی مختلف ہوتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ ان کرداروں کا انجام ان کے آغاز سے مختلف ہوتا ہے۔ قارئین ایسے کرداروں میں تبدیلی کے عوامل سے باخبر ہوتے ہیں۔ کہانی کے آخر میں کردار میں تبدیلی قاری کو حیران نہیں کرتی۔ وہ اس تبدیلی کو فطری سمجھتا ہے۔ مکمل کردار کے بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی اور سید نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔

> ''اچھے کردار وہی ہوتے ہیں جن کی بابت ناول کے ختم ہونے تک ہم کچھ نہ کچھ نئی بات معلوم کرتے رہیں۔ عام طور پر اچھے کردار نگار شروع میں کسی کردار کی کچھ اچھائیاں یا برائیاں بیان کر دیتے ہیں اور پھر اس کردار کو دوسرے کرداروں کے زیرِ اثر دکھا کر خاص خاص موقعوں پر پیش کر کے ذاتی تجربات کے اثر سے بدل بدلا کر اور خاص خاص طرز ہائے عمل کی طرف اس کا رجوع دکھلا کے اس کو مکمل کرتے رہتے ہیں۔ کبھی وہ کردار ایسے معاملات میں پڑتا دکھائی دیتا ہے کہ اُس کی فطرت بالکل بدلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کبھی اس کی فطرت دنیا کے بدلتے ہوئے معاملات کے ساتھ رفتہ رفتہ بدلتی رہتی ہے۔'' (1)

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں ایسے کرداروں کی بھرمار ہے جو سادہ کردار ہیں۔ ڈکنز کے ناولوں میں موجود کردار وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے نظر نہیں آتے۔ وہ شروع سے آخر تک ایک جیسے رہتے ہیں۔ E.M.Forster کے نزدیک۔

> ''ڈکنز کے کردار تقریباً سادہ (Flat) ہیں (Pip اور David Copperfield کی کردار نگاری میں ارتقائی منازل طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر یہ اس قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ ہے کہ وہ (کردار) ٹھوس نظر نہیں آتے بلکہ بلبلوں (Bubbles) سے مشابہ ہیں) تقریباً ہر کردار کا خاکہ ایک جملے میں سمیٹا جا سکتا ہے''۔ (2)

ناول "Oliver Twist" کے تقریباً تمام کردار سادہ (Flat) نظر آتے ہیں۔ پورے ناول میں Oliver ایک اچھے لڑکے کی تصویر کشی کرتا ہے یہاں تک کہ Fagin اور اس کے گروہ کے ساتھ تعلقات بھی اس کے اندر تبدیلی نہیں لاتے۔ وہ تمام ناول میں فرشتہ صفت لڑکا نظر آتا ہے' مسٹر براؤن لو' مسز بیڈون، مسز میلی، روز میلی اور ہیری میلی بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔ وہ اچھائی کے اس راستے سے منحرف نظر نہیں آتے جو ان کے مصنف نے ان کے لیے چنا ہے۔ اسی طرح برے کردار شروع سے آخر تک برے رہتے ہیں سوائے Nancy اور Bates کے۔ Nancy میں بری زندگی گزارنے کی عادت اس حد تک پختہ ہو چکی ہے کہ وہ مسٹر براؤن لو اور روز میلی کے کہنے کے باوجود اپنی زندگی کا رخ نہیں بدلتی وہ صرف Oliver کی معصومیت کی وجہ سے پشیمان نظر آتی ہے۔ ورنہ اس میں تبدیلی نہ ہونے کے برابر ہے۔ Rose تمام ناول میں ہمدرد لڑکی کے روپ میں نظر آتی ہے وہ Nancy کو اچھے مستقبل کا یقین دلاتی ہے۔

> ''اتنی مشکلات کے بعد تمہارا یہاں آنا اور مجھے وہ سب کچھ بتانا جو تم سن چکی ہو، تمہاری گفتگو کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ تم بتا رہی ہو سچ ہے۔ تمہاری ندامت سے مجھے لگتا ہے کہ تمہاری اب بھی اصلاح ممکن ہے'' ......لڑکی نے چیخ کر اس کے گھٹنوں پر جھکتے ہوئے کہا ''خاتون! مہربان فرشتہ صفت خاتون! تم پہلی خاتون ہو جس نے میرے لیے ایسے ہمدردانہ الفاظ کہے ہیں اگر میں نے یہ الفاظ کئی سال پہلے سنے ہوتے تو شاید یہ الفاظ مجھے اس گناہ اور دکھ بھری زندگی سے بچا لیتے، لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے، بہت دیر ہو چکی ہے''۔ Rose نے کہا ''کبھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوتی''۔ ذہنی اذیت میں مبتلا لڑکی چیختے ہوئے بولی ''میں اسے اب نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اس کی موت کا سبب نہیں بن سکتی''۔ Rose نے پوچھا ''تم ایسا کیوں کر رہی ہو؟'' لڑکی چیختے ہوئے بولی ''اُسے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، اگر میں وہ سب کچھ دوسروں کو بتا دوں جو میں نے تمہیں بتایا ہے......تو اس کی موت یقینی ہے۔ وہ جتنا

بہادر ہے اتنا ہی ظالم بھی ہے'' Rose! نے کہا'' ایک ایسا شخص جس کے لیے تم اپنے مستقبل کی ہر امید کو مسترد کر رہی ہو۔ یہ پاگل پن ہے'' لڑکی نے جواب دیا'' میں نہیں جانتی کہ یہ کیا ہے، میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ایسا ہے اور صرف میرے ساتھ ہی نہیں بلکہ میرے جیسے سینکڑوں بد نصیبوں کے ساتھ ایسا ہے۔ مجھے واپس چلے جانا چاہیے شاید یہ خدائی غصہ ہے جو میری غلطیوں کے سبب ہے......تمام سختیوں اور مصائب کے باوجود مجھے اس کے پاس ضرور جانا چاہیے یہ جانتے ہوئے کہ مجھے بالآخر اسی کے ہاتھوں ہی مرنا ہے۔''(3)

(P-371,372)

ڈکنز کے پیش کردہ کردار ناولوں کے انجام تک ایک جیسے رہتے ہیں۔ Mr.Monks جو ناول میں Villain ہے اپنی زندگی کے اختتام تک برے رجحانات کا ہی شیدائی نظر آتا ہے۔ Bill Sikes، Tobby، Dodger، Chitling ہمیشہ ایک ہی رویہ اپنائے رہتے ہیں ان میں کوئی اصلاحی پہلو نظر نہیں آتا۔

ڈکنز کے ناولوں کا کوئی کردار اندرونی اور اخلاقی مفہوم میں نمو پزیر نہیں ہوتا۔ ناول "Hard Times" (1854ء) میں Gradgrind مستثنیٰ کردار ہے۔ اپنی بیٹی Louisa کی شادی کے سانحہ کے بعد اس کردار میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ وہ انکسار کے ساتھ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا ہے۔ اب اسے خیالی اقدار کی اصل حقیقت محسوس ہونے لگتی ہے اور حقیقی محبت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

''اس نے بڑے مضمحل انداز میں اسے دیکھا۔ اس کا ہاتھ اپنی بیٹی کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ وہ بستر کے ایک طرف بیٹھ گیا......اس نے اپنے آمرانہ انداز سے قطع نظر دھیمی اور شکستہ آواز میں کہا......میری پیاری Louisa میری غریب بیٹی! وہ اس مقام پر اس قدر رنجیدہ ہو گیا کہ وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ اس نے دوبارہ کوشش (مجتمع) کی۔

میری بدنصیب بیٹی ...... یہ میرے لیے بڑے دکھ کی بات ہے کہ میں تمہیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ پچھلی رات مجھ پر جو انکشاف ہوا ہے اس کی وجہ سے میں بہت زیادہ اذیت میں مبتلا رہا ہوں اور مجھ پر اب تک وہی کیفیت طاری ہے۔''(4)

(P-198)

ڈکنز کے ناول "Great Expectations" (1861ء) میں Joc کا کردار Flat کردار ہے۔ وہ ناول کے آغاز سے انجام تک ایک جیسا ہی رہتا ہے۔ Pip کے ساتھ اس کی ہمدردی اور محبت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ ناول "David Copperfield" (1850ء) میں مسٹر مرڈستون اور مس مرڈستون بھی سادہ کرداروں کی ذیل میں آتے ہیں ان دونوں کی David سے نفرت ناول کے اختتام تک برقرار رہتی ہے اس کے برعکس Miss.Peggoty کی David سے بے لوث محبت غیر فطری محسوس ہوتی ہے اس وجہ سے یہ کردار بھی سادہ کرداروں کی صف میں شمار ہو جاتا ہے۔

شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' (1957ء) میں بھی مصنف نے سادہ (Flat) کردار دکھائے ہیں جن پر وقت کے گزرنے کا کچھ اثر نہیں ہوتا وہ مصنف کے ہاتھ میں کھیلتی ہوئی کٹھ پتلیوں کی مانند ہیں جنہیں مصنف اپنی مرضی کے مطابق گھمارہا ہے نیاز کو ناول کے آغاز سے انجام تک ایک جیسا دکھایا گیا ہے۔ وہ دغا باز ہے، چوری کی اشیاء خریدنا اور انہیں مہنگے داموں بیچنا اس کا پیشہ ہے وہ نوشا کے پورے خاندان کی تباہی کا باعث بنتا ہے اس کے کسی بھی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس سے کوئی اچھا کام سرزد ہو سکتا ہے۔ سوائے ایک موقع پر جب سلمان نیاز کے پاس اپنا تھرماس فروخت کرنے کے لیے آتا ہے۔ نیاز ترنگ میں آکر اسے پچاس روپے کی رقم دے دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو تھرماس بھی واپس لے جائے۔

''تھرماس جی چاہے تو ساتھ لیتے جاؤ''۔ نیاز نے بے نیازی سے کہا۔ سلمان نے حیرت سے پوچھا ''کیوں''؟ نیاز نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔ ''یار ہم تو شرافت پر جان دیتے ہیں۔ پیسہ سالا

تو ہاتھ کا میل ہے اِدھر آیا اُدھر گیا۔ سچ پوچھو تو اُس روز بھی تمہاری گھڑی
نہ رکھتا پھر یہ سوچ کر رہ گیا کہ پہلا سابقہ ہے تم نہ جانے کیا سوچو۔ یہ
زمانہ سالا بہت خراب ہے۔''(5)

(ص:74،75)

قاری نیاز کی اس فراخدلی پر حیران رہ جاتا ہے۔ نیاز کے کردار میں تبدیلی فطری محسوس نہیں ہوتی بلکہ مصنف کی طرف سے زبردستی مسلط کر دی گئی ہے۔ نیاز ہمدردی اور بھلائی کرنے سے عاری نظر آتا ہے۔ نیاز نہ صرف نوشا کے خاندان کی تباہی کا باعث بنتا ہے بلکہ معاشرے کے دیگر افراد بھی اس کی شیطانیت سے نہیں بچ سکتے۔ شاہ جی، استاد پیڈرو اور خان بہادر بھی اسی مٹی کے بنے ہوئے ہیں جس مٹی سے مصنف نے نیاز کو تخلیق کیا ہے۔ اس کے برعکس سکائی لارک تنظیم کے ممبران میں ہمدردی اور اچھائی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ علی احمد کا کردار نیکی اور بھلائی کی منہ بولتی تصویر ہے اس کردار پر وقت کی تبدیلی اثر انداز نہیں ہوتی۔ خان بہادر غلط مقاصد حاصل کرنے کے لیے جتنے بھی حیلے بہانے کرتا ہے علی احمد اس کے چکر میں نہیں آتا۔ وہ خان بہادر کی پے در پے مخالفت کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتا ہے لیکن اپنے مقصد سے جنوں کی حد تک محبت کرتا ہے۔ بیرونی عوامل اس کی انسان دوستی اور حب الوطنی پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ لیکن سلمان ایسا کردار ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں۔

''سلمان ''خدا کی بستی'' کا ہیرو ہے۔ مثالی ہیرو نہیں عوامی
ہیرو...... کمزور انسان ......لچکتی اور نرم مٹی کا پتلا جو حالات کی بھٹی میں
پک پک کر کندن ہو گیا ہے''(6)۔

سکائی لارک سبھی ایک جیسے نہیں، ان میں باہمی حسد اور مسابقت کے جذبات بھی ہیں اور ان میں سے بعض کمزور طاقتوں سے مفاہمتیں بھی کر لیتے ہیں۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو ڈکنز اور شوکت صدیقی کی ناول نگاری پختہ نہیں ہے۔ وہ انسانی ذہن کی گہرائیوں کو نہ سمجھ سکے وہ کرداروں کو سطحی طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار غیر فطری محسوس ہوتے ہیں وہ یا تو شیطان ہیں یا پھر فرشتے۔ وہ نارمل انسان کی طرح خوبیوں اور خامیوں کا مرقع نظر

نہیں آتے ۔تمام کردار مصنفین کی پیش کش کے آگے گونگے نظر آتے ہیں وقت میں تبدیلی ان کرداروں پر اثر انداز نہیں ہوتی ۔ چارلز ڈکنز اور شوکت صدیقی کے کردار حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے وجود میں آئے ہیں ۔

چارلز ڈکنز نے اپنے ناولوں میں ایسی دنیا تخلیق کی ہے جس کو عموماً ہم تصور (خیالی دنیا) میں لاتے ہیں ۔ یوں وہ حقیقت کو کافی حد تک تبدیل کر دیتا ہے اور اس میں خوبصورت طور پر رنگ آمیزی کرتا ہے ۔ ڈکنز اپنے دوست John Forster کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

''میرے خیال میں باریک بینی میری کمزوری ہے کہ میں ان چیزوں میں روابط دیکھ لیتا ہوں جو عموماً عیاں نہیں ہوتے'' ۔(7)

ڈکنز کے کردار ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نظر آتے ہیں کہ ایسے کردار حقیقی زندگی میں اتنے مختلف نہیں ہوتے وہ یا تو اعلیٰ خیالات کے مالک ہوتے ہیں یا پھر ادنیٰ ۔ رحمدل ہوتے ہیں یا بے رحم ۔ حقیقی دنیا تخیل میں ڈراؤنا خواب بن جاتی ہے یا پھر پریوں کا دیس ۔ ڈکنز کو پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ڈراؤنے خواب اور پریوں کے دیس کے درمیان مشترک سرحد ہے یوں دونوں صورتیں (تخیل اور حقیقت) ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں ۔ اس تصوراتی دنیا کو ڈکنز نے حقیقی دنیا میں سے تخلیق کیا ہے اور اسے اپنے فنِ تخلیق میں سمو کر زندگی عطا کی ہے ۔ اس کے ناولوں کی دنیا عجوبہ ہے جس میں زندہ انسان بستے ہیں جو حقیقی دنیا سے اخذ کئے گئے ہیں ۔ Mr.Pickwick حقیقی انسان ہے جس کی طبیعت میں فراخدلی اور انسان دوستی موجود ہے البتہ اس کی سخاوت حقیقی دنیا کے انسان سے کئی گنا زیادہ ہے ۔ Pecksniff ایک حقیقی انسان ہے جس میں مکاری کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے ۔ ناول "Martin Chuzzlewit" کے Preface میں ڈکنز لکھتے ہیں ۔

''مجھے یقین ہے کہ مسٹر Pecksniff کے کردار کو حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور یہ کہ ایسا کردار حقیقی دنیا میں موجود نہیں تھا'' (8) ۔

Pickwick اور Pecksniff دونوں کردار حقیقی ہیں پھر بھی دنیا کے عام انسانوں سے مختلف نظر آتے ہیں وہ اس لحاظ سے حقیقی ہیں کہ ان کے اندر انسانی صفات پائی جاتی ہیں لیکن ان صفات کا حد سے بڑھا ہوا استعمال انہیں عام انسانوں سے مختلف بنا دیتا ہے۔ ڈکنز انہیں مختلف زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ بدصورتی کے درمیان خوبصورتی کی جھلک دیکھتا ہے اور اسی خوبصورتی کو اپنے ناولوں کی زینت بناتا ہے۔ اسی طرح خرابیوں میں سے اچھائی نکال کر اسے اپنے فن کا حصہ بناتا ہے۔ جو کچھ اس نے لکھا وہ ہر صورت میں حقیقی دنیا میں موجود ہے لیکن قاری کے سامنے جو دنیا وہ پیش کرتا ہے وہ اس کے اپنے تخیل کی دنیا ہے۔ اس کے ناولوں کی بنیاد حقیقت پر ہے۔ ڈکنز کے ناولوں میں اُنیسویں صدی کے لندن کے چوراہے، دکانیں ، دفاتر، تنگ و تاریک محلے، جیلیں، شوروغل والی شاہراہیں، چرچ، لندن کے گردونواح میں موجود جھونپڑے اور کھلے دیہاتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ لیکن ان تمام کو اس نے اپنے تخیل کے رنگ میں پیش کیا ہے اس نے عام گلیوں کی بھیانک زندگی سے عجائبات تلاش کئے ہیں۔ جدید حقیقت پسند مصنف صرف دنیا کی تلخ حقیقتوں کا بیان کرتے ہیں اس کے برعکس ڈکنز بدصورتیوں میں سے خوبصورتیوں کی عکس بندی کرتا ہے۔

یہ یقینی امر ہے کہ ڈکنز تخیل کی بلندیوں کو اس قدر طے کرتا ہے کہ وہ حقیقی زندگی کی سچائیوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے قید کی زندگی کے خوف، پرائیویٹ سکولوں کے بھیانک پن اور یتیم بچوں پر ہونے والے مظالم سے اس کا دل لرز اُٹھتا ہے اور ڈکنز بطور Idealist اور انسان دوست اُنہیں اسی حالت پر نہیں چھوڑ دیتا بلکہ ان کی اصلاح چاہتا ہے۔ John Forster ڈکنز کے بارے میں لکھتے ہے۔

> ''نہ صرف اس کا طبعی رجحان بلکہ اس کی مکمل فطرت شدید ہمدردی سے لبریز تھی جو اس کے گردوپیش میں موجود تلخ حقائق کے مدِ مقابل رہی۔ اندرونی سکون اور پناہ کے لیے اس کے ہاں بیرونی برائیوں کے خلاف نفرت صرف تخیلاتی نہ تھی۔ وہ حقائق سے اپنے تصور (Ideal) کی آزادی اور اطمینان کی تلاش کے لیے سرگرداں رہتا ہے اور اپنی کاوشوں کے ذریعہ اس دنیا سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے جس کی شدت میں وہ واپس دھکیل دیا جاتا ہے۔'' (9)

اِن تلخ حقائق سے قطع نظر Mr.Pickwick جیسے رحمدل کی صورت میں Jingle کو آزاد کرانے کی طرف مائل ہے۔ Nickleby کے ذریعہ Smike کو اس کی برائیوں پر سرزنش کرتا ہے۔ شاعرانہ انصاف (Poetic Justice) ڈکنز کے ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے برے لوگوں کو سزا ملتی ہے اور اچھے کرداروں کو ان کے غم و آلام سے نجات ملتی ہے Micawber ایک اچھا انسان ہے وہ آسٹریلیا میں مجسٹریٹ بن جاتا ہے جبکہ Uriah Heep برا کردار ہے اسے قید تنہائی کاٹنا پڑتی ہے۔ ڈکنز کی حقیقت پسندی تخیل (Idealism) سے اُستوار ہوتی ہے۔ اس کے کردار کسی خصوصیت (اچھائی یا برائی) کا مبالغہ ہوتے ہیں۔ وہ غیر معمولی مخلوق نظر آتے ہیں۔ کچھ خوبصورت کردار ہیں اور کچھ بھیانک، لیکن روزمرہ تجربے سے الگ نظر آتے ہیں یقیناً ان کرداروں میں حقیقت نہیں ہوتی بلکہ ناول نگار اپنی ذہانت سے اُنہیں اس طرح مرتب کرتا ہے کہ وہ قاری کی توجہ کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ڈکنز کی تخیلاتی دنیا کی بنیاد دراصل حقیقی دنیا ہے لیکن جو عکس بندی اس نے کی وہ قطعی حقیقی نہیں۔

شوکت صدیقی کے ناولوں میں بھی کسی حد تک تخیل اور حقیقت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ناول ''خدا کی بستی'' میں سکائی لارک تنظیم کو انسانی بہبود کے لیے کوشاں دکھایا گیا ہے۔ ایسی تنظیموں کا وجود حقیقی دنیا میں نظر نہیں آتا بلکہ یہ مصنف کے تخیل کی پیداوار ہے۔ شوکت صدیقی دنیا کو رنج والم سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اسی مقصد کے لیے اُنہوں نے سکائی لارک تنظیم کو دکھایا ہے اور اس تنظیم کے ذریعہ وہ معاشرے کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ اسلم آزد لکھتے ہیں۔

> ''اسکائی لارکوں کی تحریک و تنظیم کے ذریعہ شوکت صدیقی نے
> ایسی تمام بے راہرویوں کے خلاف نبرد آزما قوتوں کی نشاندہی کی ہے،
> اس کی وجہ سے ناول میں ایک طرح کی مثالیت پسندی پیدا ہوگئی ہے۔
> اسکائی لارکوں کی عملی سرگرمیاں اور فلک پیما، کے اصلاحی اور رفاہی
> منصوبے ایک حد تک غیر حقیقت پسندانہ بن گئے ہیں، اقتدار پرستوں،
> خودغرضوں، استحصال پسندوں اور سرمایہ داروں کے خلاف سرگرمیوں
> کے نتیجے میں اسکائی لارکوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا

ہے۔مگر اُن کی ثابت قدمی غیر معمولی عزم و استقلال کی ترجمانی کرتی ہے،اس طرح کی تنظیموں کا وجود میں آنا کوئی آسان بات نہیں،عملی دنیا میں اس طرح کی تنظیمیں خیالی اور تصوراتی حیثیت رکھتی ہیں،شوکت صدیقی نے دراصل معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے امکانات کا جو خواب دیکھا ہے،اسکائی لارکوں کی تنظیمی سرگرمیوں کی شکل میں منظر عام پر آیا ہے''(10)۔

مصنف نے جہاں خان بہادر، استاد پیڈ رو اور نیاز جیسی ظالم شخصیتوں کو اُجاگر کیا ہے وہاں احمد علی، جیسے مثالی کردار سے بھی روشناس کرایا ہے۔احمد علی کو فرشتے سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے اندر انسانی کمزوریوں کا عکس تک نظر نہیں آتا وہ مجسم نیکی ہے احمد علی اگرچہ حقیقی انسان ہے لیکن اس میں اچھائیوں اور خوبیوں کی بھرمار ہے جو اسے حقیقی انسان سے بدرجہا بلند کر دیتی ہے پروفیسر ڈاکٹر اے۔ بی۔اشرف لکھتے ہیں۔

''احمد علی کے کردار میں نکہت ونور کی لپٹیں بسی ہوئی ہیں۔شعور و آگہی کے دیپک فروزاں ہیں اس کے ہاں زندگی سے نباہ کا بھرپور جذبہ اور حسنِ عمل کی توانائی ہے۔خلوص ومحبت کے لامتناہی سائے ہیں جن کی چھاؤں میں زندگی کی شدت اور حدت سے جلے ہوئے سلمان پناہ لیتے ہیں۔ پورے ناول میں وہی ایک کردار ہے جس کی پروقار شخصیت کا سہارا ڈھونڈنے پر ہم مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کا وہی ایک محور ہے اور بس ہر طرف تاریکی ہے ظلمت ہے۔ جہاں روشنی کی کوئی کرن پھوٹتی ہے تو وہ احمد علی کی شخصیت کا کرشمہ ہے۔اس کے پاس یدِ بیضا بھی ہے اور عصائے کلیمی بھی۔ وہ دلیل راہ بھی ہے اور نشانِ منزل بھی۔''(11)

احمد علی انسانیت کے بلند ترین منصب پر فائز ہے۔شوکت صدیقی نے حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے احمد علی کو ایک مثالی انسان بنا دیا ہے۔

حقیقی دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جو برے رجحانات و خیالات کے مالک ہوتے ہیں۔ایسے انسانوں میں کسی حد تک اچھائی کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے۔شوکت صدیقی نے حقیقی دنیا میں سے ایسے انسانوں کا انتخاب کیا ہے جو ظالم و جابر ہیں لیکن مصنف ان کرداروں کو ظلم و بربریت کی انتہا تک لے جاتا ہے۔بطور ایک مثالی حقیقت نگار کے شوکت صدیقی کا مقصد تھا کہ وہ برائیوں کو واضح طور پر صفحۂ قرطاس پر لائے۔اس نے جرائم پیشہ زندگی کے مناظر اس لیے پیش کیے ہیں کہ اُن کو پیش کر کے قاری کے دل میں ایسی زندگی سے نفرت پیدا کرائے۔خان بہادر، استاد پیڈرو، نیاز مصنف کے اسی تخیل کی پیداوار ہیں۔ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف نے خان بہادر کے کردار کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔

''نواب فرزند علی خان کا کردار ایک ایسے شخص کا کردار ہے جس کے ہونٹوں پر زہرِ خند کی ایک لہر اُبھرتی ہے تو سینکڑوں سکائی لارکوں پر چاروں جانب سے سیل بلا اُمنڈ آتا ہے۔جس کی آنکھوں میں روشنی کی ایک کرن پھوٹتی ہے تو ہزاروں ظلمتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے جس کی معصومیت کے لبادے کے لیے فیاض اور کرم الٰہی، سلطانہ ایسی بے شمار لڑکیوں کی عصمت کے دامن کو تار تار کر کے رکھ دیتے ہیں۔جس کے ایک محل کی بنیادیں اُٹھتی ہیں تو ہزاروں جھونپڑیاں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔اُن کی شریعت میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہزاروں مریضوں کی لاشوں پر مسجد کی تعمیر جائز ہے۔سیلاب زدہ، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے مفلوک الحال لوگوں کے لیے بوسیدہ کمبل مہیا کر کے گورنمنٹ سے روپیہ کمانا عین ثواب ہے۔نواب فرزند علی خان زندگی کو سودا سمجھتے ہیں اور اس سودے کے لیے روپیہ، پیسہ، طاقت، ضمیر اور ایمان ہر چیز داؤ پر لگا دینے کو تیار رہتے ہیں، ناول نگار نے اس کردار کو جس خاص مقصد کے لیے منتخب کیا ہے وہ اس میں کامیاب ہیں۔وہ نواب فرزند علی خان کے لئے ''خدا کی بستی'' کا

مطالعہ کرنے والوں کے دلوں میں نفرت کا ایک جذبہ بیدار ہوتے
ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور یہ مقصد اُنہوں نے پالیا۔'' (12)

ناول ''جانگلوس'' میں بھی کچھ کردار ایسے ہیں جن کو حقیقت اور تخیل سے مزین کیا گیا ہے ایسے کرداروں میں لالی، رحیم داد، جمیلہ، اللہ وسایا، حیات محمد وٹو، احسان شاہ سرفہرست ہیں۔ لالی میں مصنف نے ایسے اوصاف رکھ دیئے ہیں جن کی عام انسان سے توقع کرنا عبث ہے۔ لالی اگرچہ مجرم ہے لیکن وہ ہر ایک کی بھلائی کا خواہاں ہے وہ جسے بھی دکھ اور تکلیف میں مبتلا دیکھتا ہے اس کو اس مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔

شوکت صدیقی نے برائیوں میں پلنے والے فرد کو اپنے تخیل کی مدد سے اخلاقی بلندیوں پر دکھایا ہے۔ وہ مجرم ہونے کے باوجود اعلیٰ صفات کا مالک نظر آتا ہے۔ جبکہ معاشرے کے وہ افراد جن کے ہاتھوں میں معاشرے کو سدھارنے کی طاقت موجود ہے وہ اپنی غلط کاریوں کے سبب اسے بگاڑنے پر تلے ہیں۔ "Pleasure House" کے ممبران اسی طبقے کے عکاس ہیں جو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ جب اُنہیں ٹرین کے حادثے کا پتہ چلتا ہے تو وہ محض اس وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ کہیں اُنہیں اپنے پروگرام کو ملتوی نہ کرنا پڑے۔ ان چودہ افراد میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے مصیبت زدگان کی حالت پر ترس آئے قانون کے رکھوالے ہی قانون کو توڑنے کا باعث بنتے ہیں۔ ایس پی مرزا ابوالحسن، ڈپٹی کمشنر ہمدانی، ڈاکٹر بٹ، محکمہ آبادکاری کا ایڈیشنل کمشنر مسعود سب ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ایڈیشنل کمشنر مسعود کی سوچ پر قاری حیران رہ جاتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کون سی ایسی قیامت آگئی گیارہ افراد ہی تو
ہلاک ہوئے ہیں کچھ اسپتال جاتے جاتے یا اسپتال پہنچ کر ہلاک ہو
جائیں گے۔'' (13)

(ص:304)

ڈاکٹر مشرف احمد لکھتے ہیں۔ ''شوکت صدیقی صاحب نے ناول
''جانگلوس'' کی بنیاد چھوٹا چور، بڑا چور کے فلسفے یا تصور پر رکھی ہے۔ چھوٹے

چوروں کے حوالے سے وہ دراصل بڑے چوروں کو بے نقاب کرتے ہیں۔
یہ بڑے چور جیل سے بھاگے ہوئے اور خدا کی زمین میں راہِ فرار اور عافیت
کے طلبگار چھوٹے چوروں کے مقابلے میں زیادہ بڑے بڑے جرائم کرتے
ہیں لیکن ان کی دولت و ثروت اور ان کے سماجی مرتبے ان کے اصل چہروں
کو بے نقاب نہیں ہونے دیتے۔'' (14)

مصنف نے برائی کو اس قدر واضح انداز میں دکھایا ہے کہ ایسے افراد سے قاری کے دل میں نفرت شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ مصنف بھی درحقیقت قاری میں اسی چیز کو پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔

ڈکنز اور شوکت صدیقی میں انسانیت سے ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ ان کی تحریروں کا رجحان ہمیں عملی طور پر انسانی بہبود پر اُکساتا ہے غم والم میں مبتلا تمام طبقات سے ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ خصوصاً ان کے لیے جو عام مشاہدات سے ہٹ کر ہیں۔ وہ خاص طور پر قاری کی توجہ اُن افراد کی طرف مبذول کراتے ہیں جو ناسازگار حالات کا شکار ہیں۔ ڈکنز قاری کی توجہ ایسے کینہ پرور نظام کی طرف دلاتا ہے۔ جہاں مقروض قیدی، قلاش یتیم، کلیسا کے محتاج طلباء، چھوٹی عمر کے معصوم بچے لاپرواہ والدین اور ظالم اساتذہ موجود ہیں۔ ڈکنز کی انسانوں سے ہمدردی واضح اور عملی ہے۔ یہ جذباتیت سے آزاد ہے۔ بیمار اور جذباتی ماتم ڈکنز کے ہاں نہیں ملتا۔ شوکت صدیقی نے جاگیردار طبقے کے خلاف لکھا اور معاشرے کے تاریک پہلو کو دکھا کر عوام میں ظلم و جبر سے نجات کا جذبہ پیدا کیا۔ شوکت صدیقی اور چارلز ڈکنز دونوں ہی انسانی زندگی کو اس کی تمام تر صلاحیتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے معاشرتی ناانصافیوں سے دور مثالی دنیا (Utopiac World) میں لے جانا چاہتے ہیں۔ دونوں ہی دراصل انقلابی ادیب ہیں۔ البتہ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈکنز کی انقلابیت میں ایک ابدی اُمید اور Optimism کا رنگ نظر آتا ہے جو کہ شوکت صدیقی کے انتہائی تلخ اندازِ بیان میں مفقود ہے۔

چارلز ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں موجود کرداروں کا موازنہ ایک دوسرے سے کیا جا سکتا ہے۔ ''خدا کی بستی'' میں راجہ اور "Oliver Twist" میں Oliver دونوں کردار کافی مماثلت رکھتے ہیں۔
ناول "Oliver Twist" میں Oliver ایک ایسا بچہ ہے جس کی پیدائش پر اس کی ماں فوت ہو

جاتی ہے Oliver اس عورت (Agnes) کی ناجائز اولاد ہے۔ وہ یتیم خانے میں پرورش پاتا ہے جہاں اسے کھانے کے لیے بہت کم خوراک دی جاتی ہے وہ مزید خوراک طلب کرتا ہے۔

"Please, sir, I want some more" (15)

(P-15)

منتظم آلیور کے مزید خوراک طلب کرنے پر اسے مارنے لگتا ہے۔

''منتظم نے آلیور کے سر پر چمچ مارا۔ اُس کے بازوؤں کو جکڑ لیا اور محتاج خانے کے کارندے کو زوردار آواز سے بلایا۔ جب مسٹر Bumble پُر جوش انداز میں کمرے میں داخل ہوا تو انتظامیہ میٹنگ میں بیٹھی تھی اس نے انتظامیہ کے سربراہ سے کہا ''مسٹر Limbkins میں آپ سے معذرت کا طلبگار ہوں۔ آلیور ٹوئسٹ نے مزید (کھانے کے لیے) طلب کیا ہے'' (میٹنگ میں موجود) ہر شخص چونک پڑا۔ ہر چہرے پر خوف عیاں تھا۔ ''اور زیادہ'' Mr.Limbkins نے کہا۔ ''ہوش کے ناخن لو بمبل اور مجھے واضح طور پر بتاؤ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس نے اپنی مقررہ خوراک سے زیادہ طلب کیا ہے''۔ بمبل نے جواب دیا ''اس نے یہی تقاضا کیا ہے''۔ سفید کوٹ میں ملبوس سربراہ نے کہا ''اس لڑکے کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔'' (16)

(P-15)

بورڈ کے ممبران نے آلیور سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس شخص کے لیے پانچ پونڈ کا انعام مقرر کیا جو بورڈ کو Oliver سے نجات دلائے گا۔ Oliver Twist کو محتاج خانے سے نکال دیا جاتا ہے اور ایک تابوت ساز Mr.Sowerberry کے ہاں ملازم رکھ دیا جاتا ہے۔ جب Oliver، Mr.Sowerberry کے گھر پہنچتا ہے تو Mrs.Sowerberry اپنی ملازمہ شارلٹ کو حکم دیتی ہے کہ جو بچے کھچے ٹکڑے کتے کے لیے ہیں Oliver کو دے دے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتی ہے کہ لڑکا کوئی اتنا نفاست پسند نہیں وہ ان ٹکڑوں کو کھانے میں کراہت محسوس نہیں کرے گا۔

''شارلٹ اس لڑکے کو Trip (کتے کا نام) کے لیے رکھے ہوئے ٹکڑے دے دو۔ وہ صبح سے گھر نہیں آیا۔ اسے کھائے بغیر گزارا کرنا پڑے گا مجھے توقع ہے کہ یہ لڑکا اتنا نفیس نہیں کہ انہیں نہ کھائے۔ کیا تم اتنے نفیس ہو؟(17)

(P-34)

Mr.Sowerberry کے ہاں آلیور کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر Mrs.Sowerberry آلیور کے ساتھ بہت بُرے طریقے سے پیش آتی ہے۔ ایسی زندگی سے تنگ آکر آلیور اُن کے گھر کو چھوڑ کر لندن کی طرف سفر کرتا ہے کیونکہ اُس نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ لندن ایسی جگہ ہے جہاں ہر کسی کو روزگار مل جاتا ہے۔

شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' (1957ء) میں راجہ ایک بھکاری بچہ ہے جس کا باپ فسادات میں مارا جا چکا ہے اور دو بھائی قتل ہو چکے ہیں۔ راجہ کی ماں اُسے یتیم خانے بھجوا دیتی ہے اور خود طوائف بن جاتی ہے۔ یتیم خانے میں راجہ کو بھکاری بنا دیا جاتا ہے۔ نوشا حیرت سے پوچھتا ہے۔
ابے تو یتیم خانے بھی رہ چکا ہے؟

''یہ سالی بھیک مانگنے کی عادت وہیں سے تو پڑی ہے۔ وہاں سالا ایک ملاں تھا۔ یہ لمبی داڑھی تھی۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ پر ایک نمبری تھا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ چھوٹا مہتمم تو ذرا چھا تھا مگر بڑا بہت پاجی تھا۔ روزانہ شام کو معائنہ کرنے آتا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بید ہوتا۔ جو لڑکا پیسے کم لاتا بس اس کی شامت آجاتی۔ یار ایسی مار مارتا تھا کہ اب بھی یاد کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں'' راجہ نے یتیم خانے کے مہتمم کو ایک ہی سانس میں بہت سی گالیاں دے کر اپنے دل کا غبار ہلکا کیا۔ ''ایک روز مجھے صرف گیارہ آنے ملے۔ بس اسی بات پر اس کے آگ لگ گئی۔ سالے نے مار مار کر دنبہ

بنا دیا۔ اسی رات میں یتیم خانے سے نکل بھاگا۔''(18)

(ص:97)

راجہ اور نوشا بھی Oliver کی طرح نا مساعد حالات کا شکار ہیں آخر تنگ آ کر وہ بھی اپنے شہر کو چھوڑ کر کراچی کی طرف رخ کرتے ہیں راجہ نوشا سے کہتا ہے۔

''یار میرا تو جی چاہتا ہے اس سالے شہر ہی کو چھوڑ دیں بول کیا کہتا ہے''؟

''مگر جائیں گے کہاں؟''

''ابے کراچی چلیں گے۔ بڑے زوروں کا شہر ہے۔ کام تو وہاں پھٹ سانی مل جاتا ہے۔'' راجہ نے مسکرا کر کہا۔ نوشا فوراً رضامند ہو گایا۔''میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔ یار واقعی اب یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔''(19)

(ص:98)

لندن کی طرف سفر کرتے ہوئے Oliver کو راستے میں Artful Dodger ملتا ہے جو اسے بتاتا ہے کہ وہ Oliver کا تعارف ایک ایسے معزز آدمی سے کرائے گا جو اسے بغیر کسی قیمت کے کھانا اور رہنے کے لیے جگہ مہیا کرے گا۔ وہ معزز آدمی Fagin ہے جو جیب کترہ ہے۔ Fagin کے تعلقات نقب زنوں کے ساتھ بھی ہیں۔ Bill Sikes اور Tobby اس کے ساتھ شریک جرم ہیں Fagin اس شرط پر نقب زنی اور چوری کراتا ہے کہ چرائے ہوئے مال میں وہ بھی برابر کا شریک ہو گا۔ Bill Sikes اور Tobby کو کسی گھر میں ڈاکہ ڈالنے کے لیے ایک لڑکے کی ضرورت پڑتی ہے۔ Jew Fagin ان کی یہ مشکل آسان کر دیتا ہے اور Oliver کو ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ نقب زنی کرتے وقت وہ Oliver کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ Oliver کو کھڑکی کے ذریعہ اس گھر میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا جاتا ہے جہاں وہ گولی لگنے سے زخمی ہو جاتا ہے۔

راجہ اور نوشا کراچی اس مقصد کے تحت جاتے ہیں کہ وہاں اُنہیں اچھا کام مل جائے گا۔ اور وہ آرام سے زندگی بسر کریں گے۔ کراچی پہنچ کر وہ دونوں رحمان نامی شاطر آدمی کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو اُنہیں

شاہ جی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے شاہ جی مجرم آدمی ہے۔ اس کا طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ نوعمر بچوں کو لوگوں کے گھر ملازم رکھوا کر ان کے گھروں میں موجود قیمتی اشیاء کے بارے میں دریافت کرتا ہے کہ وہ کہاں رکھی ہیں۔ راجہ کو ایک گھر میں ملازمت مل جاتی ہے وہ ملازمت کے دوران آرام کی زندگی بسر کرتا ہے تو اسے اس گھر کے افراد سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ شاہ جی کے کہنے کے باوجود انجینئر کے گھر والوں کی روٹین اور جائے اثاثہ کی نشاندہی نہیں کرتا تو اسے دھمکی دی جاتی ہے اور ساتھ ہی سزا بھی۔ مجبوراً راجہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

> ''راجہ انجینئر صاحب کے ہاں شاہ جی کی ہدایت پر نوکری کرتا ہے اور شاہ جی انجینئر صاحب کے گھر کی تفصیلات راجہ کو اذیت دے دے کر پوچھتا ہے۔ پھر شاہ جی راجہ کی اطلاعات کے نشانے کے مطابق ڈاکہ ڈالتا ہے اور واپسی میں راجہ کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔'' (20)

Oliver اور راجہ کے کرداروں میں یہ مماثلت ہے کہ دونوں بے گھر ہیں۔ دونوں نے یتیم خانے میں پرورش پائی۔ ایک یتیم خانے سے نکلا تو بھکاری بن کر نکلا۔

دوسرا بھوک کو مٹانے کے لیے مزید طلب کرنے پر نکال دیا گیا۔ دونوں جرائم پیشہ افراد کے نرغے میں آ کر گمراہیوں کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ Oliver تو کچھ ہمدرد افراد Mr.Brown Low، Mrs.Maylie اور Rose Maylie کی مدد سے اس گمراہ کن زندگی سے بچ نکلتا ہے جبکہ راجہ انجینئر صاحب کے گھر چوری کے الزام میں پکڑا جاتا ہے اور قید کر دیا جاتا ہے جہاں وہ پوکر نامی لڑکے سے لڑائی کے دوران زخمی ہو جاتا ہے۔ اس کے زخم کوڑھ میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس کی ٹانگیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

Oliver اور نوشا میں بھی کافی مماثلت نظر آتی ہے دونوں جیب کتروں کے نرغے میں پھنس جاتے ہیں۔ نوشا جیل سے نکلتا ہے تو پوکر کے ہمراہ اُستاد پیڈرو کے حلقے میں داخل ہو جاتا ہے۔ استاد پیڈرو جیب کترہ ہے وہ نوشا کو بھی جیب تراشی کے نئے نئے گر سکھاتا ہے۔ نتیجتاً نوشا بھی جیب کترہ بن جاتا ہے۔

''لگ بھگ ہفتہ بھر تک اُستاد پیڈرو، نوشا کو جیب تراشی کی تکنیک سکھاتا رہا۔ زور پنجے کی مشق کرا کے اس کی انگلیاں مضبوط اور پھرتیلی بنائی گئیں۔ آخر ایک روز چکرم کی نگرانی میں اس کی ڈیوٹی مقرر کر دی گئی''۔(21)

(ص:313)

ڈکنز کے دور میں بھی جرائم عام تھے۔ جیب تراشی مستقل صنعت اختیار کر چکی تھی۔ ناول "Oliver Twist" میں ڈکنز اس برائی کو منظر عام پر لایا ہے۔لندن کی طرف سفر کرتے ہوئے Oliver کو Artful Dodger ملتا ہے جو اسے Fagin کے پاس لے جاتا ہے۔ Fagin جیب تراشوں کا سرغنہ ہے وہ Oliver کو بھی اپنے جیسا بنانے کے لیے جیب تراشی سکھاتا ہے۔ وہ اُسے نصیحت کرتا ہے کہ دوسرے لڑکوں سے اس فن کو سیکھے۔

''جو کچھ وہ تمہیں کہیں ویسا ہی کرو اور تمام معاملات میں ان کی نصیحت پر عمل کرو۔ خاص طور پر Dodger کی نصیحت پر۔ اگر تم اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلو گے تو وہ تمہیں بھی بڑا آدمی بنائے گا۔ Jew (Fagin) نے کہا'' کیا میرا رومال باہر لٹک رہا ہے''۔ آلیور نے جواب دیا'' ہاں جناب'' آلیور نے جیب کی تہہ کو ایک طرف سے تھاما جیسے Dodger کو اسے (جیب) تھامتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ کی مدد سے اس میں سے رومال نکال لیا۔ Jew نے کہا'' کیا رومال نکال لیا گیا ہے'' آلیور نے رومال دکھاتے ہوئے کہا'' رومال یہاں ہے'' بوڑھے آدمی نے Oliver کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا'' تم بڑے چست لڑکے ہو میں نے تم سے زیادہ تیز لڑکا نہیں دیکھا۔ انعام میں ایک شلنگ لو اگر تم ایسا کرتے رہے تو اپنے دور کے بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ اور اب ادھر آؤ میں تمہیں دکھاؤں گا کہ رومال میں سے کِس طرح سکے (Marks) نکالے جاتے ہیں۔'' آلیور حیران رہ گیا کہ کھیل کھیل میں

بوڑھے آدمی کی جیب تراشی سے کس طرح بڑا آدمی بنا جا سکتا ہے۔لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ Jew عمر میں اُس سے بڑا ہے وہ اس بارے میں بہتر جانتا ہے......آلیور کافی دنوں تک Jew کے کمرے میں رہا اور جیب میں موجود رومالوں میں سے سکے (Marks) نکالتا رہا۔''(22)

(P-78-79)

آلیور Fagin اور اس کے گروہ میں رہنا ناپسند کرتا ہے کیونکہ وہ مجرمانہ زندگی سے نفرت کرتا ہے۔ دونوں جرائم پیشہ افراد کو چھوڑ کر آسودہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔اسلم آزاد نے نوشا اور راجہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جرائم سے پاک پُرسکون زندگی کے خواہاں ہیں۔Oliver کو بھی نوشا اور راجہ کی صف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

''اپنے اس طرزِ زندگی سے وہ مطمئن نہیں ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی زندگی اچھے راستوں پر لگ جائے۔مگر یہ راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ان کے دل کی گہرائیوں میں اچھا انسان بننے کی خواہش موجزن تو ہے لیکن اس خواہش کی تکمیل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''(23)

Oliver کچھ عرصہ تو Fagin کے گروہ میں رہتا ہے لیکن جب وہ Bill Sikes اور Tobby کے ہمراہ Miss Maylie کے گھر نقب زنی کے دوران گولی لگنے سے زخمی ہو جاتا ہے تو Bill Sikes اور Tobby اُسے چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔Oliver کو اس گھر کے افراد ہی پناہ دیتے ہیں اور اس کا باقاعدہ علاج کراتے ہیں اور پھر انہی افراد کی مدد سے Oliver باعزت زندگی بسر کرتا ہے وہ آلیور کے لیے فرشتوں سے بڑھ کر ثابت ہوتے ہیں۔لیکن نوشا اور راجہ کو باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع Oliver کی طرح نہیں ملتا۔نوشا نیاز کا قتل کرنے کے بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے اور چودہ سال قید بامشقت کی سزا پاتا ہے۔

Fagin اور استاد پیڈرو میں بھی کافی مشابہت نظر آتی ہے۔Fagin لندن کے چوروں اور ڈاکوؤں کا سرغنہ ہے وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جیب تراشی اور چوری کے نئے نئے گُر سکھاتا ہے۔وہ

اُنہیں سگریٹ نوشی اور شراب پینے کی کھلی اجازت دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان چیزوں سے وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بدراہ کرسکتا ہے۔ وہ بہت ہی مکار انسان ہے جب Dodger آلیور کو Fagin کے پاس لاتا ہے تو وہ Oliver کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتا ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ آلیور اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرلے۔ وہ آلیور کو بھی جیب کترہ بنانا چاہتا ہے۔ جیب تراشی کی مشق کراتے ہوئے جب آلیور Fagin کی اُمیدوں سے بڑھ کر تیز نکلتا ہے تو وہ اسے ایک شلنگ انعام میں دیتا ہے۔

اُستاد پیڈرو بھی جیب کتروں کا سربراہ ہے اس کے گروہ میں بہت سے لڑکے شامل ہیں۔ وہ اُنہیں جیب تراشی کے نئے نئے طریقوں سے روشناس کراتا ہے وہ ہر نئے آنے والے کا دل جیتنے کے لیے شیرینی منگواتا ہے اور اسے اپنے تمام شاگردوں میں بانٹ کر اپنی شاگردی میں شامل کرتا ہے۔ پوکر کے ہمراہ جب نوشا اُستاد پیڈرو کے گروہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی آمد پر بھی یہی عمل دہرایا جاتا ہے۔

''اُستاد نے اپنی ترکی ٹوپی پہنی، شیرینی کو مصلے پر رکھا۔ آنکھیں بند کیں اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر نیاز دینے لگا۔ نیاز سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے نوشا کو قریب بلایا اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اپنی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی۔ شاگردی کی رسم ادا ہو چکی تھی۔ نوشا اب اُستاد پیڈرو کے حلقے میں باقاعدہ طور پر شامل ہو چکا تھا۔''(24)

(ص:312)

Fagin اور اُستاد پیڈرو دونوں جیب کترے ہیں۔ دونوں نے اس مقصد کے لیے اپنا اپنا گروہ تیار کررکھا ہے۔ اُستاد پیڈرو صرف جیب تراشی میں ماہر ہے جبکہ Fagin جیب تراشی کے ساتھ ساتھ نقب زنی بھی کراتا ہے۔ لیکن ناول کے آخر میں Fagin کو اپنے کیئے کی سزا ملتی ہے اُسے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں جبکہ اُستاد پیڈرو دھڑلے سے زندگی بسر کرتا ہے۔ نوشا جب جیب تراشی کی رقم (راجہ کے علاج کے لیے) چھپانا چاہتا ہے تو اُستاد پیڈرو فوراً اُس سے رقم نکلوالیتا ہے اور اُسے اپنے گروہ سے بھی نکال دیتا ہے۔ اُسے اس بات کا ذرہ برابر خوف نہیں کہ نوشا اس کے لیے مسائل پیدا کرسکتا ہے وہ پولیس کو اس کے

ٹھکانے اور ساتھیوں کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ وہ نوشا کو دھمکی دیتا ہے۔

''سالے! آنکھیں کیا دکھا رہا ہے۔ جا کر تھانے میں رپٹ لکھا دیکھیو کہ اُستاد پیڈرو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے۔ تجھے بھی قسم ہے جو جا کے نہ کہیو۔ پر یہ بھی سن لے کہ دو ہزار نقد بھتا دیتا ہوں۔ سالے کسی ہوا میں نہ رہنا۔ تو یہ سمجھ رہا ہو کہ اُستاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔''(25)

(ص:374)

شوکت صدیقی کے ناول ''جانگلوس''(1989ء) میں لالی اور رحیم داد، ڈکنز کے ناول "Great Expectations"(1861ء) میں موجود کرداروں Magwitch اور Compeyson سے مماثلت رکھتے ہیں۔ لالی ایک ہمدرد انسان ہے۔ مصنف نے اسے اس انداز سے تخلیق کیا ہے کہ وہ مجرم ہونے کے باوجود نیکی کا فرشتہ محسوس ہوتا ہے۔ جہاں بھی کوئی گڑ بڑ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے لالی وہاں موجود ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ وہ فطرتاً رحمدل اور ہمدرد انسان ہے۔ جب حیات محمد وٹو کی بیوی ''ناصرہ'' کی زندگی خطرے میں ہوتی ہے تو لالی اس وقت کمرے میں موجود ہوتا ہے اور اسے حیات محمد وٹو کی گرفت سے آزاد کراتا ہے۔ اسی طرح اوورسیئر کی بیوی ''زرینہ'' کو انجینئر سے نجات دلاتا ہے۔ ''بختاور'' کو اس کے سُسر کے ظلم وستم سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ چوہدری نور علی کھوکھر کے بیگار کیمپ سے ''اللہ دینو'' اور تمام قیدیوں کو رہا کراتا ہے۔ ''لالی'' کو قدیم داستانوں میں موجود ''بزرگ'' سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے لیے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔

ناول "Great Expectations" میں قیدی Magwitch لوہار بچے Pip سے درانتی اور کچھ کھانے پینے کی اشیاء لینے کے بعد اس کا احسان نہ صرف عمر بھر یاد رکھتا ہے بلکہ اسے معزز آدمی (Gentleman) بنانے کے لیے تمام عمر محنت کرتا ہے۔ وہ Pip سے ملاقات کے دوران کہتا ہے۔

"You acted nobly, my boy, said he. Noble Pip! and I have never forgot it!"(26).

(P-340)

''پیارے لڑکے! میں نے تمہیں ایک معزز شخص بنایا ہے یہ میں ہی ہوں جس نے ایسا کیا ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں جو بھی گنی (Guinea) کماؤں گا وہ تمہارے لیے ہوگی۔ میں نے یہ بھی قسم کھائی تھی کہ میں جتنا دولت مند ہوں گا تم بھی اتنے دولت مند ہو گے میں نے سادہ زندگی گزاری تاکہ تم آرام دہ زندگی گزار سکو۔ میں نے مشقت سے کام کیا تاکہ تمہیں کوئی مشقت نہ کرنی پڑے...... میری طرف دیکھو۔ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو بلکہ میرے لیے بیٹے سے بڑھ کر ہو۔ میں رقم اکٹھی کرتا رہا ہوں صرف اس لیے کہ تم اسے استعمال کر سکو۔ جب میں کرائے کا گڈریا تھا اور ایک تنہا جھونپڑے میں رہتا تھا تو بھیڑوں کی شکلوں کے درمیان میں لوگوں تک کے چہروں کو بھول گیا تھا۔ اس وقت میں تصور میں تمہارا چہرہ دیکھا کرتا تھا۔ جب میں دوپہر کا یا شام کا کھانا کھا رہا ہوتا تھا تو مجھ سے کئی بار چاقو ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑتا تھا کیونکہ مجھے تصور میں تم اپنی طرف دیکھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں تمہیں کئی دفعہ اتنا ہی واضح طور پر دیکھ سکتا تھا جیسا کہ میں نے تمہیں پہلی دفعہ دلدلی علاقے میں دیکھا تھا۔'' (27)

(P-344)

Magwitch اگرچہ مجرم ہے لیکن قاری اس کے لیے رحم اور ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ اس کا انجام حقیقتاً بہت تکلیف دہ ہے۔ اس کی ظاہری شخصیت سخت اور کھردری محسوس ہوتی ہے لیکن اس کا دل انسانی ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر Pip کو دیکھنے کے لیے آتا ہے جب Pip کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی خیر خواہ Magwitch ہے نہ کہ Miss Havisham تو اس کی اُمیدوں کا محل چکنا چور ہو جاتا ہے اور اس کی خواہشات مٹی میں مل جاتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مجرم کے ساتھ ہمدردی محسوس کرتا ہے اور اپنی تمام اُمیدوں کو قربان کر کے Magwitch سے

وفاداری کرتا ہے۔

ناول ''جانگلوس'' کا کردار رحیم داد Compeyson سے مماثلت رکھتا ہے۔ رحیم داد لالی کے برعکس ظالم اور سفاک انسان ہے جب تک وہ لالی کے ساتھ رہتا ہے اس کی فطرت کھل کر سامنے نہیں آتی جونہی لالی پکڑا جاتا ہے اور رحیم داد تنہا رہ جاتا ہے تو اس کی فطرت کھل کر سامنے آتی ہے۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے ''حکیم نذر محمد چشتی'' کو قتل کر کے اسے جیل کی وردی پہنا دیتا ہے اور خود اس کے کپڑے پہن لیتا ہے۔ ''چوہدری نور الٰہی'' جو اسے گھر میں پناہ دیتا ہے، رحیم داد اس کا گلہ دبا دیتا ہے اور اس کے کلیم کے کاغذات لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی بہن کے قتل کا سبب بنتا ہے اور بہنوئی کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ رحیم داد اپنے آپ کو بچانے کے لیے جرم پر جرم کئے جاتا ہے۔

غرض جو بھی رحیم داد کے ساتھ بھلائی کرتا ہے وہ اپنے خیر خواہ کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے جو بھی اس کے قریب آتا ہے وہ آکاس بیل کی طرح اُسے ختم کر دیتا ہے۔ کوٹلہ ہرکشن کا زمیندار ''اللہ وسایا'' جس کی گھوڑی کے نیچے آ کر رحیم داد زخمی ہو جاتا ہے، وہ رحیم داد کو اپنے گاؤں لے جاتا ہے اس کا علاج کراتا ہے۔ اللہ وسائے کی بیوی ''جمیلہ'' رحیم داد کی تیمارداری کرتی ہے اس تیمارداری کا صلہ رحیم داد اُنہیں یہ دیتا ہے کہ احسان شاہ کے ساتھ مل کر اللہ وسایا کو اس بھیانک انداز سے قتل کراتا ہے کہ انسانیت بھی کانپ اُٹھتی ہے لیکن اس پتھر دل انسان کے دل میں اثر تک نہیں ہوتا۔ وہ جمیلہ اور اس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے احسان شاہ کے ساتھ مل کر ساز باز کرتا ہے اور جمیلہ کے ساتھ دھوکے سے شادی کر لیتا ہے۔

Compeyson بھی رحیم داد کی طرح لالچی انسان ہے۔ وہ ایک مالدار خاتون "Miss Havisham سے شادی کا وعدہ کر کے اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیتا ہے اور شادی والے دن فرار ہو جاتا ہے۔ Magwitch، Compeyson کے بارے میں بتاتا ہے۔

''Compeyson کا کام دھوکہ دہی، دستاویزی جعل سازی، چرائے ہوئے بینک نوٹ کا چلانا تھا Compeyson انتہائی خطرناک انسان تھا۔ وہ جرم کرنے کے بعد اپنے آپ کو بچا لیتا تھا۔ وہ خود تو نفع حاصل کرتا تھا۔ لیکن دوسرے کو اس پھندے میں ڈال دینا، یہ Compeyson کا کاروبار تھا۔ اس کا دل لوہے کی آری کی طرح سخت تھا۔ وہ اس قدر بے حس تھا جیسے موت اور اس کا ذہن شیطانی تھا۔ Compeyson

کے ساتھ اس کاروبار میں ایک اور آدمی بھی شریک تھا جس کا نام Arther تھا...... وہ اور Compeyson کئی سال پہلے ایک امیر خاتون کو دھوکہ دے کر بہت سی رقم ہتھیا چکے تھے۔'' (28)

(P-372)

لالی اور رحیم داد، Magwitch اور Compeyson کی طرح جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہیں۔ لالی Magwitch کی طرح رحمدل انسان ہے۔ جبکہ رحیم داد Compeyson کی طرح ظالم اور احسان فراموش شخص ہے۔

"David Copperfield" (1850ء) میں Mr.Murdstone اور ''خدا کی بستی'' (1957) میں نیاز کے کردار کافی حد تک مماثلت کے حامل ہیں۔ Mr.Murdstone ڈیوڈ کا سوتیلا باپ ہے۔ ڈیوڈ اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ماں کی محبت میں اپنے علاوہ کسی کی شراکت پسند نہیں کرتا۔ Mr.Murdstone ڈیوڈ پر بہت ظلم کرتا ہے۔ Mr.Murdstone اور اس کی بہن ڈیوڈ کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ Miss Murdstone ڈیوڈ کے گھر کو سنبھال لیتی ہے۔ سوائے ڈیوڈ کی تعلیم کی طرف توجہ دینے کے ڈیوڈ کی ماں (Clara) کا اپنے گھر پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اس کام میں بھی دونوں بہن بھائی مداخلت کرتے ہیں۔ ڈیوڈ ان دونوں کی موجودگی میں ٹھیک طرح سے نہیں پڑھ سکتا۔ ایک دن Mr.Murdstone ڈیوڈ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بید موجود ہے جس سے وہ ڈیوڈ کی پٹائی کرتا ہے۔

''وہ سنجیدگی کے ساتھ آہستہ آہستہ مجھے میرے کمرے کی طرف لے گیا...... اور جب ہم وہاں پہنچے تو اس نے میرے سر کو اچانک اپنے بازو تلے مروڑا۔ مسٹر مرڈسٹون مجھے مہربانی کر کے نہ پیٹیں میں نے سیکھنے کی کوشش کی ہے جناب لیکن جب آپ اور Miss Murdstone میرے قریب ہوتے ہیں تو میں نہیں سیکھ سکتا...... ہاں بے شک تم یاد نہیں کر سکتے ڈیوڈ ہم کوشش کر کے دیکھتے ہیں Mr.Murdstone نے کہا۔ اُس نے میرے سر کو اپنے شکنجے میں کس لیا لیکن میں کسی نہ کسی طرح

ٹیڑھا ہو کر گھوم گیا اور اسے لمحہ بھر کے لیے روک دیا اور اس سے التجا کی وہ مجھے نہ مارے۔ یہ تو بس لمحہ بھر کے لیے تھا کہ میں نے اسے روکا۔ اس نے اگلے لمحہ بڑی شدت کے ساتھ مجھے پیٹا اور اسی لمحہ میں نے اس کے بازو کو پکڑ لیا جو اس نے میرے منہ پر رکھا ہوا تھا اور اسے دانتوں سے کاٹ لیا...... اس نے مجھے اتنا مارا گویا کہ وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ پھر وہ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر چلا گیا اور میں بخار اور بیماری کی حالت میں وہیں فرش پر پڑا رہا۔''(29)

(P-60-61)

Mr.Murdstone ڈیوڈ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے لندن میں معمولی کارخانے پر کام کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ جہاں وہ صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔

نیاز (خدا کی بستی) بھی نوشا، سلطانہ اور انو کا سوتیلا باپ ہے۔ وہ نوشا کی ماں رضیہ سے اس نقطۂ نظر سے شادی کرتا ہے کہ رضیہ کی وفات کے بعد وہ سلطانہ سے شادی کرلے گا۔ وہ رضیہ کی زندگی کا بیمہ کئی ہزار کے عوض کراتا ہے اور انشورنس کی رقم ہتھیانے کے لیے اسے زہریلے انجکشن لگوا کر موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ شہاب قدوائی لکھتے ہیں۔

''نیاز سلطانہ کی والدہ کا ایک دوری رشتہ دار ہے جس کی نظر سلطانہ کے حسن و جمال پر ہے مگر وہ موقع کی مناسبت سے سلطانہ کی ماں سے شادی کر کے ایک بڑی رقم کے عوض اس کا بیمہ کرا دیتا ہے۔ سازش کے تحت سلطانہ کی ماں کے قتل کے بعد نیاز بیمہ کی رقم حاصل کر کے ایک بڑا آدمی بن جاتا ہے۔''(30)

وہ نہ صرف سلطانہ کی ماں کی موت کا سبب بنتا ہے بلکہ نوشا کے گھر کے ہر فرد کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بناتا ہے نوشا کو چوری سکھاتا ہے سلطانہ کی عصمت دری کرتا ہے اور انو سے بے انتہا نفرت کرتا ہے۔ وہ اس (انو) سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہر وقت اسے ڈانٹتا اور مارتا رہتا ہے۔ انو نیاز کے رویے سے

سہارا رہتا ہے۔ ایک روز نیاز انو سے کہتا ہے کہ وہ اس کے لیے الماری میں رکھی ہوئی شراب کی بوتل اُٹھا لائے۔ انو نیاز سے اس قدر خوفزدہ رہتا ہے کہ بوتل اُٹھاتے ہوئے گھبرا جاتا ہے اور بوتل اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔

''انو نے الماری سے گلاس نکالا۔ بوتل اُٹھائی۔ اسی وقت نیاز نے چیخ کر کہا''ابے کہاں مر گیا؟''انو گھبرا گیا۔ بدحواسی میں بوتل ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ فرش پر گرتے ہی اس کے کئی ٹکڑے ہوگئے۔ وہسکی برسات کے پانی کی طرح بہنے لگی۔ کمرے میں اس کی تیز بو پھیل گئی۔ نیاز لمحہ بھر تک تو خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے انو کے بال پکڑ لیے۔ کئی بار زور زور سے اُسے جھنجوڑا اور پھر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ وہ گیند کی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اس کی کمر پر، پیٹ پر، سینے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ انو کے سینے پر ایک بھرپور لات پڑی تو وہ درد سے بلبلا کر فرش پر دہرا ہو گیا۔ نیاز نے ایک اور کس کے لات ماری۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ نیاز بھینسے کی طرح منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ انو ذرا دیر تک تو لاش کی مانند بے سدھ پڑا رہا پھر اس نے اُٹھ کر کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر نیاز نے جانے نہ دیا۔ لپک کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا دیا۔ انو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ نیاز آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا ارگریباں پکڑ کر ایک بار پھر اسے زور زور سے جھنجوڑنے لگا۔ پہلی بار انو نے جرأت پیدا کی اور جل کر اپنا پورا منہ نیاز کی کلائی پر رکھ کر گوشت چبا ڈالا۔ نیاز نے تکلیف سے گھبرا کر بڑا گھناؤنا سا منہ بنایا۔ زور سے چلایا''مار دیا سالے نے''اور پھر انو کو فرش پر گرا کر اس کے

سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپا۔ نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر زور لگایا۔ انو کے حلق سے بلیوں کے غرانے کی سی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ نیاز نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ انو آنکھیں پھاڑے دیر تک نیاز کو تکتا رہا اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ پھر وہ درد سے کراہنے لگا۔ نیاز نے چیخ کر کہا۔ ''تو ابھی میرے گھر سے نکل جا۔ ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گا''۔ انو نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ڈگمگا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ سانس الجھی ہوئی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ نیاز نے گالی دے کر کہا ''ابے اب جاتا ہے کہ سالے کچھ اور لے گا'' وہ اس کی جانب خوں خوار نظروں سے گھورتا ہوا لپکا۔ انو جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔ گھگیا کر فریاد کرنے لگا۔ ''اب نہیں، اب نہیں''۔ نیاز بولا ''تو پھر نکل جا یہاں سے''۔ اس نے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ زور سے دھاڑا ''دیکھ اب لوٹ کے نہیں آنا ورنہ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا''۔ انو اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے کمرے کے باہر چلا گیا لیکن وہ کوٹھی میں نہیں ٹھہرا۔ لان عبور کر کے پھاٹک سے نکلا اور سنسان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔'' (31)

(ص: 321، 322، 323)

نیاز اور Mr.Murdstone دونوں سوتیلے باپ ہیں۔ نیاز کا کردار اس قدر گھناؤنا ہے کہ قاری کے دل میں اس کے خلاف خوف اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے Mr.Murdstone بھی ظالم انسان ہے

وہ نہ صرف ڈیوڈ کے ساتھ بُرے طریقہ سے پیش آتا ہے بلکہ ڈیوڈ کی ماں Clara کے ساتھ بھی۔ Clara ان تکالیف کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتی اور جلد ہی فوت ہو جاتی ہے۔ نیاز رضیہ کو زہر یلے انجکشن لگوا کر مار دیتا ہے جبکہ Mr.Murdstone کے ڈیوڈ کے ساتھ ظالمانہ رویہ کی وجہ سے Clara مر جاتی ہے۔ دونوں ہی ظالم ہیں۔ نیاز انو کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ Mr.Murdstone بھی ڈیوڈ کو گھر سے نکال کر ایک معمولی کارخانے پر کام کرنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے اور اس کے گھر پر قبضہ کر لیتا ہے۔ David تو اپنی آنٹی Miss.Betsey کے پاس رہنے کے لیے چلا جاتا ہے جہاں اُس کی بقیہ زندگی پُرسکون گزرتی ہے جبکہ:

''انو گھر سے نکالے جانے کے بعد غلط صحبت میں پھنس کر جنسی غلط کاریوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔''(32)

بیگم افضل لکھتی ہیں:

''نیاز کا کردار ہمارے معاشرے کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ جو ہوس زر کی خاطر ایک خودار، غیرت منداور غریب خاندان کو تباہی اور موت کی تاریکیوں میں دھکیل دیتا ہے۔''(33)

(David Copperfield) Mr. Peggotty، (Great Expectations) Joe Gargrey اوراحمد علی (خدا کی بستی) کے کردار کافی مشابہت رکھتے ہیں Joe، Pip کی حقیقی اولاد نہیں بلکہ وہ اس کا سالا ہے لیکن وہ پپ کے ساتھ اس قدر ہمدردی اور محبت سے پیش آتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ایسے انسان بھی دنیا میں بستے ہیں۔ Pip جب Gentleman بن جاتا ہے تو Joe Gargrey کے ساتھ اس کے رویے میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لیکن Joe ایسا شخص ہے جس کے دل میں Pip کے لیے محبت کا جذبہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ اس کی محبت میں ذرہ برابر کمی محسوس نہیں ہوتی۔ Pip جب مقروض ہو جاتا ہے اور بیماری کی حالت میں کمرے میں پڑا ہوتا ہے یہ Joe ہی ہے جو اس کی عیادت کے لیے آتا ہے اور قرض کی رقم بھی ادا کرتا ہے۔

Emily مسٹر پیگوٹی کی اولاد نہیں وہ اس کی بھتیجی ہے جب Emily اپنے چچا کو دھوکہ دے کر

Emily کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو اس وقت بھی Mr.Peggotty کے دل میں Steerforth کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ اُسے ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ جانے سے پہلے وہ Peggotty اور David سے کہتا ہے:

''میں اُسے قرب و جوار میں تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں اگر وہ گھر آ جاتی ہے...... لیکن افسوس ایسا نہیں ہو سکے گا۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ میں اُسے واپس لے آؤں...... اگر میں کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤں یاد رکھو کہ اس کے لیے میرے آخری الفاظ یہ ہیں۔ میری محبت میری پیاری بچی کے لیے ہے اور میں اُسے معاف کرتا ہوں!''(34)

(P-495)

ایسی محبت کا وجود شاذ و نادر ہی ممکن ہے۔

علی احمد، Joe Gargrey اور Mr.Peggotty سے اس وجہ سے مماثلت رکھتا ہے کہ وہ نیاز کے بیٹے ''ایاز'' کے ساتھ حقیقی باپ جیسی محبت کرتا ہے حالانکہ ''ایاز'' سلطانہ کی ناجائز اولاد ہے۔ وہ نہ صرف سلطانہ کو قبول کرتا ہے بلکہ اس کے بچے کو بھی اپنا بچہ سمجھتا ہے علی احمد ایک موقع، پر روتے ہوئے ایاز کو مہربان باپ کی طرح گود میں اُٹھا لیتا ہے۔

''علی احمد نے بچے کو گود میں اُٹھالیا۔ اس کے رخساروں کا بوسہ لیا ہنس کر بولا۔ سلمان! یہ سب سے چھوٹا سکائی لارک ہے۔''(35)

(ص:467)

Mr.Peggotty، Joe Gargrey اور علی احمد فرشتہ صفت انسان ہیں۔ تینوں کی فطرت عمدہ ہے تینوں کی بچوں سے محبت اعلیٰ سطح کی ہے۔ ڈکنز اور صدیقی نے ان کرداروں کے ذریعہ اعلیٰ اقدار کے حامل افراد سے روشناس کرایا ہے۔ دونوں نے تخیل اور حقیقت کے امتزاج سے ان کرداروں کو تخلیق کیا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے کردار مکمل (Round) نہیں بلکہ سادہ (Flat) ہیں۔ دونوں ناول نگاروں کے کردار حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے وجود میں آئے ہیں۔ دونوں کے ناولوں میں موجود کرداروں کا آپس میں تقابل کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے ناولوں میں کچھ کردار ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ان میں راجہ اور Oliver، نوشا اور Oliver، Fagin اور اُستاد پیڈ رو، لالی اور Magwitch، رحیم داد اور Compeyson، علی احمد، Joe Gargrey اور Mr.Peggotty ایک دوسرے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈکنز اور صدیقی کی کردار نگاری میں بہت زیادہ مماثلت ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، نورالحسن ہاشمی ڈاکٹر، ''ناول کیا ہے؟'' ص:26، لکھنو، نسیم بکڈپو 1964ء۔

2۔ E.M.Forster "Aspects of the Novel",PP. 78,79,Penguin Books, 1968.

"Dickens's people are nearly all flat (Pip and David Copperfield attempt roundness, but so diffidently that they seem more like bubbles than solids). Nearly every one can be summed up in a sentence".

3۔ Charles Dickens "Oliver Twist" P.371,372, Thomas Nelson And Sons Ltd.

"Your coming here, at so great a risk, to tell me what you have heard; your manner, which convinces me of the truth of what you say; your evident contrition and sense of shame, all lead me to believe that you might be yet reclaimed ...... "Lady", cried the girl, sinking on her knees, "dear sweet, angel lady, you are the first that ever blessed me with such words as these; and if I had heard them years ago they might have turned me from a life of sin and sorrow; but it is too late ...... it is too late!".

"It is never too late" said Rose ...... "It is", cried the girl, writhing in the agony of her mind; "I cannot leave him! I could not be his death!"

"Why should you be?" said Rose.

"Nothing could save him", cried the girl. "If I told others what I have told you ...... he would be sure to die. He is the boldest, and has been so cruel!" "Is it possible", Cried Rose, "That for such a man as this you can resign every future hope, and the certainty of immediate rescue? It is

madness". "I don't know what it is answered the girl; "I only know that it is so, and not with me alone,but with hundreds of others as bad wretched as myself. I must go back. Whether it is God's wrath for the wrong I have done, I do not know; but I am drawn back to him through every suffering and ill-usage, and should be, I believe, if I know that I was to die by his hand at last."

4۔ Charles Dickens "Hard Times" P.198, Penguin Books, 1994

"He had a jaded anxious look upon her, and his hand usually steady, trembled in hers. He sat down at the side of the bed ...... He spoke in a subdued and troubled voice, very different from his usual dictatorial manner ...... My dear Louisa. My poor daughter." He was so much at a loss at that time, that he stopped altogether. He tried again."My unfortunate child. ...... It would be hopeless for me, Louisa, to endeavour to tell you how overwhelmed I have been, and still am, by what broke upon me last might."

5۔ شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:74،75، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز 1995۔

6۔ اے بی اشرف، ڈاکٹر، ''خدا کی بستی......ایک عوامی ناول'' ص:87، مشمولہ 'ادب اور سماجی عمل'' ملتان، کاروانِ ادب، 1980۔

7۔ Stephen Wall (ed) "Charles Dickens", P.203,
Penguin Critical Anthologies, 1970.

"I think it is my infirmity to fancy or perceive relations in things which are not apparent generally."

Charles Dickens "Martin Chuzzlewit", -8

Penguin Popular Classics, 1994.

"I believe, that Mr.Pecksniff is an exaggeration, and that no such character ever existed."

Stephen Wall (ed) "Charles Dickens" P.202 -9

"Not his genius only, but his whole nature, was too exclusively made up of sympthy for, and with, the real in its most intense form, to be sufficiently provided against failure in the realities around him. There was for him no city of the mind, against outward ills, for inner consolation and shelter. It was in and from the actual he still stretched forward to find the freedom and satisfactions of an ideal, and by his very attempts to escape the world he was driven back into the thick of it."

10- اسلم آزاد، ''اردو ناول آزادی کے بعد'' ص:234، نئی دہلی، نریندر ناتھ سوز، 1990ء۔

11- اے بی اشرف، ڈاکٹر، ''خدا کی بستی، ایک عوامی ناول'' ص، 88۔

12- ایضاً ص:85، 86۔

13- شوکت صدیقی، ''جانگلوس'' (جلد اول)، ص:304، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1998۔

14- مشرف احمد، ڈاکٹر، ''جانگلوس، نیا اسلوب'' ص:39، ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی، مارچ، اپریل، 2001۔

Charles Dicken"Oliver Twist",P.15, Thomas Nelson And Sons Ltd. -15

Ibid, P.15,16. -16

"The master aimed a blow at Oliver's head with the lable, pinioned him in his arms, and shrieked for the beadle.

The board were sitting in solemn conclave, when Mr.Bumble

rushed into the room in great excitement, and addressing the gentleman in the high chair, said ......

"Mr. Limbkins, I beg your pardon, sir! Oliver Twist has asked for more."

There was a general start. Horror was depicted on every countenance.

"For more!" said Mr.Limbkins. "Compose yourself, Bumble, and answer me distinctly. Do I understand that he asked for more, after he had eaten the supper allotted by the dietary?"

"He did, sir," replied Bumble. "That boy will be hung", said the gentleman in the white waistcoat. "I know that boy will be hung."

17۔ Ibid, P.34.

"Charlotte ...... give this boy some of the cold bits that were put by for Trip. He hasn't come home since the morning, so he may go without' em. I dare - say the boy isn't too dainty to eat' em - are you, boy?"

18۔ شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:97۔

19۔ ایضاً ص:98۔

20۔ اسلم آزاد، ''اردو ناول آزادی کے بعد'' ص:235، 236۔

21۔ شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:313۔

22۔ Charles Dickens "Oliver Twist", PP.78,79.

"Do everything they bid you, and take their advice in all matters especially the Dodger's, my dear. He'll be a great man himself, and will

make you one too, if you take pattern by him__Is my handkerchief hanging out of my pocket, my dear?" said the Jew, stopping short.

"Yes, sir", said Oliver.

"See if you can take it out without my feeling it, as you saw them do when we were at play this morning." Oliver held up the bottom of the pocket with one hand, as he had seen the Dodger hold it, and drew the handkercheif lightly out of it with the other. "Is it gone?" cried the Jew.

"Here it is, sir", said oliver, showing it in his hand.

"You are a clever boy, my dear", said the playful old gentleman, patting oliver on the head approvingly.

"I never saw a sharper lad. Here's a shilling for you. If you go on in this way, you'll be the greatest man of the time. And now come here, and I'll show you how to take the marks out of the handkercheifs."

Oliver wondered what picking the old gentleman's pocket in play had to do with his chances of being a great man. But, thinking that the Jew, being so much his senior, must know best ...... For many days oliver remained in the Jew's room, picking the marks out of the pocket handkerchiefs."

23۔ اسلم آزاد، ''اردو ناول آزادی کے بعد'' ص:235۔

24۔ شوکت صدیقی ''خدا کی بستی'' ص:312۔

25۔ ایضاً ص:374۔

26۔ Charles Dickens"Great Expectations,P.340,Oxford University Press, 1957.

Ibid, P.344. -27

"Yes, Pip, dear boy, I've made a gentleman on you! It's me wot has done it! I swore that time, sure as ever I earned a guinea, that guinea should go to you. I swore arterwards, sure as ever I spec' lated and got rich, you should get rich. I lived rough, that you should live smooth; I worked hard that you should be above work ...... Look'ee here, Pip. I'm your second father. You're my son ___ more to me nor any son. I've put away money, only for you to spend. When I was a hired - out shepherd in a solitary hut, not seeing no faces but faces of sheep till I half forgot wot men's and women's faces was like, I see yourn. I drops my knife many a time in that hut when I was a eating my dinner or my supper, and I says, "Here's the boy again, a looking at me whiles I eats and drinks! "I see you there a many times as plain as ever I see you on them misty marshes."

Ibid, P.372. -28

"Compeyson's business was the swindling, handwriting forging, stolen bank - note passing, and such like. All sorts of traps as compeyson could set with his head, and keep his own legs out of and get the profits from and let another man in for, was compeyson's business. He'd no more heart than a iron file, he was as cold as death, and he had the head of the Davil afore mentioned.

There was another in with compeyson, as was called Arther___Him and Compeyson had been in a bad thing with a rich lady some years afore, and they made a pot of money by it".

-29 Charles Dickens "David Copperfield", PP.60,61.
Thomas Nelson and Sons Ltd.

"He walked me up to my room slowly and gravely ...... and when we got there, suddenly twisted my head under his arm. "Mr.Murdstone! sir!" I cried to him; "don't pray don't beat me! I have tried to learn, sir; but I can't learn while you and Miss.Murdstone are by. I can't, indeed!". "Can't you, indeed, David?" he said "We'll try that."

He had my head as in a vice; but I twined round him somehow, and stopped him for a moment, entreating him not to beat me. It was for a moment that I stopped him, for he cut me heavily an instant afterwards; and in the same instant I caught the hand with which he held me in my mouth, between my teeth, and bit it through. ...... He beat me then as if he would have beaten me to death ...... Then he was gone, and the door was locked outside; and I was lying, fevered and hot, ... upon the floor."

-30 شہاب قدوائی، ''نقد و نظر کا متلاشی ناول نگار، شوکت صدیقی'' ص:147، 148، مشمولہ سہ ماہی ''کہکشاں'' کراچی، اکتوبر تا دسمبر 2001ء۔

-31 شوکت صدیقی ''خدا کی بستی'' ص:321، 322، 323۔

-32 شہاب قدوائی، ''نقد و نظر کا متلاشی ناول نگار، شوکت صدیقی'' ص:148۔

-33 بیگم افضل حق، ''اردو ادب کے پچیس سال اور ''خدا کی بستی'' ص:156، مشمولہ سہ ماہی ''کہکشاں'' کراچی، اکتوبر تا دسمبر 2001ء۔

-34 Charles Dickens "David Copperfield" P.495.

"I'm a-going to seek her, fur and wide. if she should come home while I'm away __ but ah, that ain't like to be! __ or if I should bring her back, __ If any hurt should come to me, remember that the last words I left for her was, 'My unchanged love is with my darling child, and I forgive her!".

35۔ شوکت صدیقی ''خدا کی بستی'' ص:467۔

باب پنجم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا اسلوبِ بیان

باب پنجم

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کا اسلوبِ بیان

اسلوبِ بیان کے حوالے سے اگر ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کا تنقیدی انداز میں تقابل کیا جائے تو مماثلت اور امتیازات کے بہت سے نکات سامنے آتے ہیں۔ منظر نگاری اور مکالمہ نگاری میں صدیقی اور ڈکنز آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔ جہاں تک زبان کے استعمال اور مزاح نگاری کا تعلق ہے دونوں کا اپنا اپنا مخصوص انداز ہے ڈکنز کے ناولوں کی زبان جمالیاتی ادب کی زبان ہے جبکہ صدیقی اپنے ناولوں میں روزمرہ استعمال کے عامیانہ قسم کے جملوں کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

ڈکنز اپنے ناولوں میں قاری کی توجہ مرکوز کرنے، ان کی دلچسپی قائم رکھنے، ان کو متاثر کرنے، ان میں جوش اور جذبہ پیدا کرنے اور انہیں خوش کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ یہ تمام مقاصد حاصل کرنے کے لیے اس نے الفاظ کو بطور وسیلہ استعمال کیا ہے انتہائی سادہ الفاظ میں اندازِ بیان کو اسلوب کہا جاتا ہے ڈکنز کو الفاظ کے استعمال پر عبور حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں بڑی احتیاط کے ساتھ چنتا اور استعمال کرتا ہے۔

ڈکنز کے اسلوب کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ برے کرداروں کے لیے کمتر اور پست الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ مثلاً جیب کتروں کے سرغنہ Fagin کو "The Merry Old Gentleman" اور چھوٹے چور کو "Young Gentleman" کہتا ہے۔ وہ کسی فرد پر زیادتی نہیں کرتا۔ R.H.Hone اپنی کتاب "Charles Dickens, A New Spirit of The Age" میں لکھتا ہے۔

> ''جب وہ ایک لڑکی کے بارے میں قاری کو متعارف کراتا ہے تو وہ
> اس طرح کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس کے چہرے پر غازہ نمایاں ہے اس
> کے کپڑے چمکیلے سرخ رنگ کے ہیں اس کے بوٹ سبز ہیں اس کے بالوں میں
> زرد رنگ کے کاغذی ربن ہیں...... اس کے فوراً بعد وہ اس کے متعلق اشارہ
> کرتے ہوئے اسے 'یہ نوجوان خاتون (This Young Lady)

کہہ کر پکارتا ہے اگر وہ اس لڑکی کو برے نام سے پکارتا تو اس طرح کتاب تباہ
ہو جاتی جبکہ قاری مکمل طور پر جانتا ہے کہ وہ غریبوں کے کس دھتکارے ہوئے
طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور یوں مصنف اسے برا نام دینے سے بچتے ہوئے قابل
تضحیک تاثر پیدا کرتا ہے۔ اپنے اسی انداز کو اپناتے ہوئے وہ ایک نوعمر چور کو
'The First Named Young Gentleman' کہتا ہے جبکہ زیادہ عمر والے
Jew فیگن کو جو مجسم برائی ہے اور نوخیز ذہنوں کو جیب تراشی کا فن سکھاتا ہے......
چونچال مگر وضعدار بوڑھا آدمی، (The Merry Old Gentleman)
کہتا ہے...... یوں مصنف قاری کو اپنی تحریر سے متنفر نہیں کرتا۔'' (1)

ایسا اسلوب اختیار کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ڈکنز عام قاری کے لیے نہیں لکھتا بلکہ جمالیاتی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے لکھتا ہے۔ وہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ تخیلاتی قاری پر اس کی تحریر کا کیا اثر ہوگا اسے اس بات سے سروکار نہیں کہ عوام الناس پر کیا اثر ہوگا۔ اپنے فن کی تاثیر کا اندازہ وہ اپنی ذات کی کسوٹی پر کرتا ہے۔

''اگر میرے قارئین اس کے پڑھنے سے آدھی خوشی یا دلچسپی
پائیں جتنی اس کے متن نے مجھے دی ہے تو میرے لیے ان کا مشکور ہونا
واضح ثبوت ہے۔'' (2)

ڈکنز کے برعکس شوکت صدیقی ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو عوام الناس کی زبان ہے اگرچہ ایسا کرنے سے ان کا اسلوب ادبیت کے رنگ سے تو محروم ہو گیا ہے لیکن ایک زوال پذیر معاشرے کی تصویر ضرور منظرِ عام پر آ گئی ہے۔ صدیقی کے پیش کردہ کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں ان افراد کے اندازِ گفتگو پر قاری حیران رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں۔

''ناول کے بیشتر کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے
عوامی لب و لہجہ اور بے ساختہ عوامی زبان پورے ناول میں غالب نظر آتی
ہے۔ ایک مخصوص طبقے کی روزمرہ اور ان کی بعض مخصوص اصطلاحات کو

پڑھ کر شوکت صدیقی کے مشاہدے پر حیرت ہوتی ہے انہوں نے اس طبقے کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے کہ اکثر ان کے مشاہدے پر تجربے کا گمان ہونے لگتا ہے۔''(3)

شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز کی زبان میں واضح فرق ان کے جرائم پیشہ کرداروں کی زبان سے عیاں ہے۔

''سالے تو مجھے چک پھریاں دیتا ہے۔ حرام کے تخم نے ناک کٹوا دی۔ اللہ رکھا کہے گا پیڈرو نے نہ جانے کیا الم غلم شاگرد رکھ چھوڑے ہیں۔ اس چھپ ست سے اپنی یوں ہی لگتی ہے۔ شہر کے ایک ایک اڈے پر یہ بات پہنچ جائے گی۔ تف ہے سالی ایسی استادی پر ساری عزت کرکری ہوگئی۔''(4)

(ص:372)

''میں تجھے اچھی طرح جان گیا ہوں تو ایک نمبر حرام کا تخم ہے۔ استاد پیڈرو نے دس روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف پھینکا حقارت سے منہ بگاڑا۔ لو سالے خان اپنے کفن کے لیے لیتے جاؤ یہ کام تیرے بس کا نہیں۔ تو تو بھڑوا دکھے ہے ان ہی کی طرح پٹیاں نکالتا ہے۔ اب جا کے اپنی ماں کے لیے کوئی یار ڈھونڈ''(5)

(ص:374)

شوکت صدیقی کے برعکس ڈکنز کا اندازِ تحریر دیکھئے۔

"Fair or not fair", retorted Sikes, "hand over, I tell you! Do you think Nancy and me has got nothing else to do with our precious time but to spent it in scouting arter, and kidnapping,

every young boy as gets grabbed through you? Give it here you avaricious old skeleton; give it here!"(6)

(P-139)

"So you wanted to get away, my dear, did you"? said the Jew, taking up a jagged and knottd club which lay in a corner of the fireplace; eh?" (7)

(P-141)

"Wanted to get essistance; called for the police, did you? sneered the Jew, catching the boy by the arm. W'll cure you of that, my young master."(8)

(P-141)

شوکت صدیقی کا کردار ''استاد پیڈرو'' نوشا کو غصے کے عالم میں سالے خان، حرام کا تخم اور بھڑوا کہہ کر پکارتا ہے جبکہ Charles Dickens کا کردار "Bill Sikes" غصے کے عالم میں Fagin کو Old Skeleton کہتا ہے۔ اسی طرح "Fagin" آلیور کو طنزیہ انداز میں My Dear اور My Young Master کہہ کر پکارتا ہے جو ڈکنز کے نفاست پسند ہونے کی دلیل ہے۔

ڈکنز کے ہاں عموماً جاہل اور اُجڈ طبقے کی زبان کا استعمال ملتا ہے لیکن وہ اپنے ناولوں میں گالیاں یا پست معیار کی زبان استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان پڑھ طبقے کی زبان کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔

"I am a going to seek her, fur and wide." (9)

(P-495)

"It's like you did, Master Davy. Not that I

Know'd then she was theer, sir but along of her creeping soon arter wards under Emily's little winder, when she see the light come, and whisp' ring 'Emily, Em'ly, for Christ's sake, have a woman's heart towards me. I was once like you! Those was solemn words, Mast'r davy, fur to hear!" (10)

(P-353)

"Which I meanter say, "Cried Joe, 'that if you come into my place bull-baiting and badgering me come out! which I meanter say such as if you are a man, come on! which I meanter say that what I say, I meantersay and stand or fall by!"(11)

(P-150)

مندرجہ بالا اقتباسات میں ڈکنز نے اَن پڑھ، جاہل اور اُجڈ افراد کی زبان سے متعارف کرایا ہے۔ ان کے یہ کردار لفظ going کے بجائے a-going، For کی بجائے Fur، afterwards کی بجائے arterwards، There کی بجائے Theer، were کی بجائے was، knew کی بجائے know'd، mean to say کی بجائے meantersay اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح لفظ Enthosiasm کو Enthuazymoosy اور Volume کو Volum کہتے ہیں۔

ڈکنز پر اُجڈ زبان کے استعمال اور گرائمر کی غلطیوں کا الزام لگایا جاتا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس کے نزدیک زبان کے استعمال سے کرداروں کا ایک دوسرے سے فرق دکھانا مقصود ہے تاکہ ان کی پہچان ہو جائے۔ چنانچہ

Mr.Micawber اپنے مددگار ساتھی سے ظاہر شکل وصورت کے لحاظ سے ہی مختلف نہیں بلکہ باتونی پن، احمقانہ گفتگو اور پارلیمانی صحافیانہ انداز کی وجہ سے بھی مختلف ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ڈکنز کا صرف ایک سٹائل نہیں بلکہ کئی سٹائل ہیں اس کے ہر کردار کا اپنا مقامی اظہار ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔

شوکت صدیقی نے بھی کرداروں کی مناسبت کے لحاظ سے الفاظ میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کا اظہار وہ ''جانگلوس'' کے صریر خامہ'' میں اس طرح کرتے ہیں۔

''مکالموں میں کردار کے سماجی پس منظر کے مطابق عام طور پر ''ق'' کی بجائے ''ک'' ہی استعمال کیا۔ مقامی رنگ پیدا کرنے کے لیے لب ولہجہ بھی اسی مطابقت سے اختیار کیا۔'' (12)

اُنہوں نے لفظ ''قاتل'' کو ''کاتل'' ۔ ''طاقت'' کو ''طاکت'' ''قبضہ'' کو ''کبضہ''، ''قبر'' کو ''کبر''۔ ''طلاق'' کو ''طلاک''۔ ''مشقت'' کو ''مشکت''۔ ''موقع'' کو ''موکع''۔ ''مشرقی'' کو ''مشرکی''۔ ''مقتول'' کو ''مکتول'' لکھا ہے۔ انہوں نے جانگلیوں کی زبان کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ وہ قانون کو کنون کہتے ہیں تو صدیقی بھی ہمیں ویسا ہی سناتے ہیں۔ لالی طاہرہ سے کہتا۔

''تم مجھے بے کوف، چگد، احمک، جانگلو اور نہ جانے کیا کیا کہہ چکی ہو۔ پر تم نے یہ بھی سوچا کہ خود تمہارے پاس عکل کتنی ہے...... ماسٹر جی وظیفے پڑھتے ہیں، بٹی عشک لڑاتی ہیں اور میں بے وکوف، احمک اور جانگلی ہوں۔'' (13)

(ص:103)

شوکت صدیقی کے اَن پڑھ اور جرائم پیشہ کرداروں کا طرزِ اظہار کچھ یوں ہے۔

''سیٹھ! دو فشٹ کلاس ڈبل چائے تو مارو۔ ذرا بالائی اچھی ڈلوانا۔ لمڈا دبلا ہو کر آیا ہے۔ اس نے محبت سے پوکر کے بازو کو دبایا۔ ابے کچھ کھانے کو بھی مل رہا تھا تیری تو ہڈیاں نکل آئیں۔'' (14)

(ص:306)

''بس کل تو تم دونوں بڑے فروٹ گئے تھے۔ آج کیا ہوا؟''
''آج تو صرف ایک موقع لگا۔کل چار دفعہ کاری گری کی تھی''۔''نہیں بے اتنی تیزی ٹھیک نہیں۔تم نے کل یہ بات کیوں نہیں بتائی۔بس ایک دفعہ کاری گری دکھایا کرو۔ورنہ دھر لیے جاؤ گے۔ جتنا ملے گا نہیں اتنا الفتے کھا جائیں گے۔''(15)

(ص:308-309)

''اماں دیکھ رہے ہو استاد، سالا خوامخواہ کے لیے مجھ سے فلاشٹین کر رہا ہے۔وہ رانپٹا دوں گا کہ بتیسی نکل پڑے گی۔''(16)

(ص:370)

جرائم کی دنیا میں پلنے والے یہ افراد لفظ فسٹ کلاس کو فنشٹ کلاس، لڑکے کو لمڈا، رہا تھا کو ریا تھا، پکڑ لیے جاؤ گے کو دھر لیے جاؤ گے۔ مذاق کو فلاشٹین اور تھپڑ کو رانپٹا کہتے ہیں۔
اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

''کرداروں کی ذہنی سطح، ماحول اور معاشرے کے اعتبار سے اُنہوں نے مؤثر زبان استعمال کی ہے۔غنڈوں اور جیب کتروں کی زبان احمد علی اور پروفیسر کی زبان میں فرق ہے۔راجہ، شاہ جی، استاد پیڈرو کی زبان اور سلمان، جعفری، صفدر بشیر اور ڈاکٹر زیدی کی زبان میں فرق ہے ناول کا ہر کردار اپنی اپنی زبان بولتا نظر آتا ہے۔''(17)

شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز اس حد تک تو آپس میں مماثلت رکھتے ہیں کہ دونوں کے ناولوں میں اَن پڑھ اور اُجڈ طبقے کی گفتگو کا اظہار ملتا ہے۔لیکن دونوں میں جو واضح فرق ہے وہ یہ کہ ڈکنز کی تحریر آلائشوں سے پاک ہے اور ان کے ناولوں میں Obscenity نہیں جبکہ شوکت صدیقی کا ناول بالخصوص ''جانگلوس'' Obscenity سے محفوظ نہیں۔
شوکت صدیقی اور چارلس ڈکنز کے ہاں مکالمہ نگاری کا فن اُن کے کرداروں کی ذہنی اور نفسیاتی

کیفیات کو اُجاگر کرنے سے قاصر ہے۔یعنی دونوں ادیبوں کا مکالمہ کردار نگاری میں کوئی مدد فراہم نہیں کرتا۔ شوکت صدیقی کے ہاں مکالمہ کردار کی گہری عکاسی کرنے کی بجائے معاشرتی اور معاشی مسائل کی عکاسی گہرے قنوطی رنگ کی آمیزش کے ساتھ کرتا ہے۔سمندر کے کنارے راجہ اور نوشا کی گفتگو میں قنوطیت کا رنگ حاوی نظر آتا ہے۔

''یار جی چاہتا ہے، مرجاؤں'' نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا اس کی گردن دیوار سے ٹکی تھی آنکھیں آسمان کی جانب تھیں اور ٹانگیں دریا کی طرف تھیں۔نوشا اس کی بات سن کر کچھ اس قدر خوفزدہ ہوگیا کہ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا ''سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔''

...... راجہ ذرا دیر خاموش رہا، پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔''یار تو نے ناحق روک لیا۔مرجاتا تو اچھا تھا میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا۔ کوئی نہ روتا۔میرا بیٹھا ہی کون ہے۔نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن کوئی بھی تو نہیں'' اور وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔''(18)

(ص:93،94)

ڈکنز کے ہاں مکالمے کا استعمال صدیقی کی نسبت کم ہوا ہے ان کے ہاں مکالمہ کردار نگاری کی بجائے قاری کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے استعمال ہوا ہے۔جو صدیقی کے ہاں مفقود ہے۔"David Copperfield" میں David کے متعلق Aunt Betsey کا Mr.Dick سے استفسار اور Mr.Dick کا جواب ڈکنز کے اعلیٰ ادبی ذوق کی ضمانت ہے۔

''میری آنٹی نے کہا کہ میں اس بچے کا کیا کروں؟ مسٹر ڈک نے غور کیا اور خوشی کے ساتھ ہچکچاتے ہوئے کہا'' کیا تم نے اسے کپڑوں کے لیے ماپا ہے''۔(19)

(P-232)

اسی ناول میں Miss Betsey ڈیوڈ کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتے ہوئے کہتی ہے۔

''میری آنٹی نے کہا'' کسی بات میں گھٹیا نہ ہو، کبھی جھوٹ نہ بولو، کبھی ظالم نہ بنو ان تینوں گناہوں سے پرہیز کرو اور میں ہمیشہ تمہارے بارے میں پرامید ہوسکتی ہوں۔'' (20)

(P-235)

دونوں ادیبوں کے ہاں ان کے کردار اپنے مزاج، موڈ اور فلاسفیز کو مکالمہ کے ذریعہ بیان کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں دونوں ادیبوں کے ہاں مکالمہ کہانی کے بہاؤ کو متاثر نہیں کرتا۔ کرداروں کے درمیان ہر قسم کی غیر ضروری اور فالتو بحثوں سے گریز کیا گیا ہے۔

ڈکنز اور صدیقی دونوں کے ناولوں میں منظر کشی کی گئی ہے۔ دونوں نے قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ڈکنز کے ہاں ان قدرتی مناظر کا بیان اس کے ناولوں کو زندگی کی رعنائیوں اور خوبصورتیوں سے منسلک کرتا ہے۔ ناول "David Copperfield" میں David مس پیگوٹی کے ساتھ Yarmouth جاتا ہے وہاں کے ماحول کا بیان بڑا دلکش ہے سمندری علاقے اور Mr.Peggotty کے گھر کی خوب منظر کشی کی گئی ہے۔

''سمندر سے آتی ہوئی ہوا کو سننا۔ ویران ہموار سطح پر رینگتی ہوئی دھند کے متعلق جاننا اور آگ پر دیکھا اور سوچنا کہ سوائے اس مکان کے اور کوئی مکان بھی نزدیک نہیں ہے اور یہ بھی ایک کشتی ہے تو یہ خیال جادو جیسا لگتا۔'' (21)

(P-33)

''جب ہم گلی میں داخل ہوئے (جو میرے لیے کافی عجیب تھی)
اور ہم نے مچھلی، رسوں کے ریشوں اور کولتار کی بو سونگھی اور ملاحوں کو
ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیکھا، اور گاڑیاں پتھروں پر شور کر رہی تھیں میں
نے محسوس کیا کہ ایسی مصروف جگہ کے ساتھ میں نے ناانصافی کی ہے اور

میں نے Peggotty سے بھی یہی کہا۔ جس نے میرے خوش کن اظہار
کو بڑے اطمینان سے سنا''۔(22)

(P-30)

اسی ناول میں ڈیوڈ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پرانے گھر میں موجود سامان کو فروخت کیا جا رہا ہے اور یہ کہ مسٹر مرڈسٹون اور مس مرڈسٹون گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں اور گھر بند پڑا ہے تو وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ اور اس پرانے پیارے گھر کو یاد کر کے David جو تصور قائم کرتا ہے وہ ایک تنہا اور ویران گھر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

''یہ سوچ کر مجھے دکھ ہوا کہ پرانی پیاری جگہ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔
خودرو پودے باغ میں اُگ کر قدآور ہو گئے ہوں گے۔ اور بکثرت
راستوں پر گرے ہوئے، نمدار ہوں گے۔ میں نے تصور کیا کہ موسم سرما
کی ہوائیں اس کے گرد کیسے چنگھاڑتی ہوں گی۔ ٹھنڈی بارش کیسے شیشے پر
برستی ہوگی۔ کیسے چاند خالی کمروں کی دیواروں پر بھوت بناتے ہوں
گے۔ ان کی رات کے وقت تنہائی کو دیکھتے ہوئے میں نے قبرستان میں
اس قبر کے متعلق سوچا جو درخت کے نیچے موجود تھی۔ اور ایسا دکھائی دیا
جیسے کہ مکان بھی مر چکا ہے اور ہر وہ چیز جو میرے والدین کے ساتھ
وابستہ تھی غائب ہوگئی''۔(23)

(P-261)

ناول "Bleak House" (1853ء) میں سرد مہینے کی بھرپور منظر کشی کی گئی ہے۔ سردی اس قدر زیادہ ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے سورج کی موت واقع ہو چکی ہے ہر جگہ دھند نے ڈیرے ڈالے ہیں اور ہر چیز اس ٹھٹھرتی دھند میں منجمد ہو چکی ہے۔

''ہر طرف دھند تھی۔ دھند دریا کے بالائی حصے پر تھی۔ جہاں یہ
سبز چراگاہوں میں سے بہتا تھا۔ دھند دریا کے زیریں حصے پر تھی جہاں

یہ جہاز رانی سے پیدا شدہ گندی تہوں اور پانی کی آلودگیوں میں سے
لڑھکتا ہوا چلا جاتا ہے۔ Essix کی دلدلوں پر دھند تھی۔ دھند کینٹ کی
اونچائیوں پر تھی ...... غصیلے کپتان کے بند کمرے کے اندر، اس کے سہ
پہر کے حقے کی نالی اور چلم میں دھند تھی۔ دھند تختۂ جہاز پر کانپتے ہوئے
نو آموز ملاح کے انگوٹھوں اور انگلیوں کو ظالمانہ طور پر کاٹ رہی تھی۔
پلوں پر گزرتے ہوئے لوگ جو دھند کے آسمان میں سے منڈیروں کے
اوپر جھانک رہے تھے۔ دھند ان کے گرد تھی جیسے وہ ایک غبارے میں
ہوں اور دھند والے بادلوں میں لٹکے ہوئے ہوں۔'' (24)

(P-1)

ناول کے آغاز میں اس دھند کو Chancery کی عدالت کے قوانین سے منسلک کیا گیا ہے۔
عدالتی قوانین نافذ کرنے والوں کی ذہنی دھند اور ماحول پر چھائی ہوئی دھند دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔
ناول "Dombey and Son" (1846-48ء) میں Paul Dombey بیماری کی حالت
میں اپنی موت سے کچھ دیر قبل بیرونی ماحول کو اپنے تخیل کی آنکھ سے کچھ یوں دیکھتا ہے۔

''جب سورج کی کرنیں سرسراتے ہوئے پردوں میں سے اس
کے کمرے کے اندر آئیں اور سامنے والی دیوار پر سنہرے پانی کی طرح
لہروں کی صورت میں چلیں۔ اسے احساس ہوا کہ شام ہو رہی ہے اور یہ
کہ آسمان سرخ اور خوبصورت تھا۔ جونہی یہ عکس ختم ہوا اور دیوار پر
اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ بالآخر رات ہوگئی۔ پھر اس نے سوچا کہ لمبی سڑکوں
پر لیمپ نقطوں کی صورت میں کیسے نظر آتے تھے اور کیسے سکون کے ساتھ
ستارے ان کے اوپر چمک رہے تھے۔ اس کے تخیل کی عجیب اُڑان تھی
کہ وہ دریا پر گھومے جس کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ وہ بڑے شہر میں
سے بہہ رہا ہے اور اب اس نے سوچا کہ یہ کس قدر سیاہ ہے اور یہ کتنا

گہرا نظر آئے گا جس میں ستاروں کے ہجوم منعکس ہو رہے ہوں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سمندر کے ساتھ ملنے کے لیے لگاتار لڑھکتا چلا جا رہا ہے۔'' (25)

(P-238)

ڈکنز کے ہاں مناظر کی بہترین مصوری اس کے مختلف ناولوں میں موجود مناظر سے عیاں ہے۔ مناظر کا یہ بیان اس کے ناولوں کو ادبی اور فنکارانہ جوہر عطا کرتا ہے۔ یہ مناظر قاری کی سمعی و بصری حس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔

ڈکنز کی طرح شوکت صدیقی کے ناولوں میں بھی مناظر کی مصوری کی گئی ہے۔ ان کے ناولوں میں موجود مناظر کہانی کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

''ناول کے مناظر واقعات کا منطقی سبب فراہم کرتے ہیں ...... جہاں کہیں بھی مناظر کا بیان ہے اس میں فنکار نے اپنے مشاہدات کی باریکی اور ذوقِ جمال کی لطافت کے ساتھ واقعاتی تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ نوشا کی ماں بیوہ ہے اور اسی لیے سادہ کپڑے پہنتی ہے، مگر جیسے جیسے نیاز سے جذباتی قربت ہوتی جاتی ہے، اس کے [illegible] یلی کے امکانات پیدا ہوتے ہیں، ایک رات نوشا کی ماں نے سلطانہ کا بسنتی دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، نیاز نے نوشا کی ماں کو اس رنگ میں دیکھا تو اس پر بھی ایک فطری ردِعمل ہوا اس واقعاتی سلسلے کے پس منظر میں جو فضا ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔

''سردیاں جا رہی تھیں اور گرمی کی آمد آمد تھی، درختوں میں پت جھڑ لگ چکا تھا دن بھر تیز ہوائیں چلتیں اور راستوں پر خزاں کے مارے ہوئے زرد پتے کھڑکھڑاتے پھرتے، دھوپ کی تپش بڑھ جاتی، مگر راتیں بڑی سہانی ہوتی تھیں، پھاگن کا مہینہ تھا، چاند نکلتا تو در و بام آئینہ خانہ بن جاتے، شفاف چاندنی سے دل میں کسک اُٹھتی اور کتنی موہوم خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتیں''۔ یہ منظر آنے والے واقعات کے لیے ایک ہم آہنگ جذباتی فضا تیار کرتا ہے۔'' (26)

ناول میں جا بجا مناظر کا بیان ناول نگار کے ذوق جمال کی دلیل ہے۔

''بھادوں کی مدھ ماتی رات باہر آنگن میں اتر آئی تھی۔ شیشم کے پتے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے، عود وعنبر کے سرمئی مرغولوں کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے...... رات اور ڈھل گئی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ افقی سرحدوں پر کافوری شمعیں روشن ہوگئیں'' (27)

(ص:122)

''ستمبر کی ایک شام کا ذکر ہے چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ آگ سے نارنجی شعلے ابھر رہے تھے۔ باہر رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شیشم کے درخت سے زرد زرد پتے ٹوٹ کر آنگن میں گھر رہے تھے۔ ہوا چلتی تو بکھرے ہوئے پتے کھڑکھڑاتے بڑی پُر اسرار آہٹ پیدا ہوتی۔ انہی آہٹوں میں ملی جلی آواز دروازے پر ابھری۔'' (28)

(ص:156)

ناول میں سلطانہ کی خود سپردگی کو ماحول سے منسلک کیا گیا ہے۔ رات کا وقت ہے۔ تیز ہوا چل رہی ہے۔ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے۔ ماحول مزید بھیانک ہو جاتا ہے۔

''ساون کا مہینہ لگ چکا تھا۔ آسمان پر اودی اودی بدلیاں گھر گھر کر آتیں۔ مینہ برستا اور ہر طرف جل تھل ہو جاتا۔ برسات کی ایک ایسی ہی رات تھی۔ پچھم سے گھٹائیں اُمڈیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر ٹپ ٹپ بج رہے تھے۔ ہوا کی سرسراہٹیں سیٹیوں کی طرح رات کے سناٹے میں چیخ رہی تھیں۔ اچانک بجلی چلی گئی...... سلطانہ خوفزدہ ہوگئی...... اسی اثنا میں

کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی کھٹ کھٹ کھٹ۔
ڈر کے مارے سلطانہ مسہری کی پٹی سے چمٹ گئی...... دروازے پر رک
رک کر کھٹ کھٹ ہوتی رہی۔ نیاز رک رک کر اسے آواز دیتا رہا۔ آخر
سلطانہ نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا...... نیاز نے پوچھا ''تم کو ڈر تو نہیں
لگے گا'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر سلطانہ کا بازو تھام لیا۔ ''چلو آج میرے
کمرے میں سو جاؤ''......اور جھپاک سے اسے بازوؤں پر اُٹھا لیا......بھیگی
ہوئی سیاہ بخت رات اور سیاہ ہوگئی۔(29)

(ص:340،339،338)

ڈاکٹر حنیف فوق لکھتے ہیں۔

''اس واقعہ کے بیان میں شوکت صدیقی نے فنی چابک دستی کا
ثبوت دیا ہے۔ سلطانہ کو اپنی لق و دق، تنہا، مایوس اور بے سہارا زندگی کا
احساس ہے۔ اس ذہنی فضا کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے جو خارجی فضا
قائم کی ہے (موسلا دھار بارش، ہوا کی چیخیں، قدموں کی آواز، تاریکی
وغیرہ) وہ بھی جسمانی سپردگی کے اس سانحہ کا پس منظر ہے۔''(30)

ناول ''جانگلوس'' میں باغ کے پر فضا منظر کا بیان آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے۔

''دونوں ایک پر فضا باغ کے کنارے پگڈنڈی پر چل
رہے تھے۔ پگڈنڈی خاصی کشادہ تھی۔ اس پر سرخ بجری بچھی تھی جو
جوتوں کی رگڑ سے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں
کے اوپر آ گیا تھا۔ ہر طرف بسنتی دھوپ پھیلی تھی۔ مارچ کا تیسرا ہفتہ ہو
چکا تھا۔ دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت تھی پت جھڑ ختم ہو چکا تھا۔ بہار کی آمد
آمد تھی۔ باغ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے ہوا میں
جھوم رہے تھے باغ میں پھولوں اور میووں کے درخت تھے۔ نرم نرم

گھاس کا دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان سے پتھر کی بنی ہوئی پختہ نہر گزرتی تھی۔ نہر پر دو بڑے بڑے فوارے تھے۔ فواروں سے پھوٹتی ہوئی پانی کی جھالر دھوپ میں جھلملا رہی تھی۔ باغ کے اس پار درختوں کی اوٹ سے بنگلے کی اونچی چار دیواری نظر آتی تھی۔'' (31)

(ص:128)

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں مناظر کی تصویر کشی اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ دونوں مناظر کے بیان میں مہارت رکھتے ہیں اور اپنی قوت متخیلہ سے قاری کے آگے ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ یہ سماں غیر مرئی نہیں بلکہ حقیقی محسوس ہوتا ہے اور قاری اپنے آپ کو اسی ماحول کا جز و تصور کرنے لگتا ہے۔

ڈکنز کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت اس کا مزاحیہ انداز ہے۔ ڈکنز کا یہ مزاحیہ انداز اسے شوکت صدیقی کے یاسیت بھرے انداز سے جدا کرتا ہے۔

ڈکنز کو بطور مزاح نگار ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ اس کی شہرت کو اس کے مزاح کی وجہ سے چار چاند لگ گئے۔ درحقیقت مزاح ڈکنز کے فن کی روح ہے۔ جو صرف ہونٹوں سے ادا نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کے دل کی آواز ہے اور یہ مزاح ہی ہے جو اس کے فن کو قوسِ قزاح کے رنگوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ اپنے مزاحیہ کرداروں کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے کرداروں کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ ان کی نمائندگی کرنے کے لیے ایک منتخب ممبر کو پارلیمنٹ میں بھیجا جا سکتا ہے۔ ڈکنز نے لاتعداد مزاحیہ کردار دکھائے ہیں جن میں Mrs.Gamp، Mrs.Nipper، Mr.Barkis، Mr.Micawber، Mr.Grimwig، Mr.Pumblechook شامل ہیں۔ یہ مزاحیہ کردار اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں اور اپنے ذاتی تصور کے پیشِ نظر تنہا زندگی گزارتے ہیں۔ Mr.Dick بادشاہ چارلس کے سر کے خبط میں زندہ ہے۔ Mr.Micawber اپنے خوابوں کا جائزہ لیتے ہوئے جیتا ہے۔ Mr.Pecksniff، Metaphors کی وجہ سے زندہ ہے۔ Mr.Grimwig اپنا سر کھانے کی دھن میں زندہ ہے۔ تیز اور حساس تخیل سے ڈکنز نے بہت سی مزاحیہ Situations اور واقعات تخلیق کئے ہیں۔ ڈکنز نے جہاں مزاحیہ کرداروں کے ذریعہ مزاح پیدا کیا ہے وہاں مزاحیہ صورت واقعہ سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ڈیوڈ اپنی پیدائش کے وقت

رونے کو گھڑی بجنے سے ہم آہنگ کرتا ہے۔

"The clock began to strike and I began to cry simultaneously."(32)

(P-1)

David اپنی آنٹی Miss.Betsey کے بارے میں بتاتا ہے کہ جب Miss.Betsey اس کی پیدائش پر اس کے گھر آئی تو گھنٹی دینے کی بجائے اپنا ناک کھڑکی کے شیشے پر دبا دیا جس سے مزاحیہ صورتحال پیدا ہوگئی۔

''جب وہ گھر پہنچتی تو اس نے اپنی پہچان کا ایک اور ثبوت دیا۔ میرا باپ اکثر اشارہ کیا کرتا تھا کہ وہ عام عیسائی کی طرح شاذو نادر ہی عمل پیرا ہوتی ہے اور اب گھنٹی بجانے کی بجائے وہ آئی۔ اور اس نے اس کھڑکی پر اپنے ناک کو اس حد تک دباتے ہوئے اندر دیکھا کہ میری غریب پیاری ماں کہا کرتی تھی کہ یہ (ناک) ایک لمحے میں ہی مکمل ہموار اور سفید ہوگئی۔''(33)

(P-4)

ناول "Great Expectations" (1860-61ء) میں Pip نے Mr.Wopsle کی جس انداز میں تصویر کشی کی ہے وہ انتہائی مزاحیہ ہے۔

''وہ ایک پراسرار شخص نظر آتا تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں سے ایک بند تھی جیسے وہ نہ نظر آنے والی بندوق کے ساتھ کسی چیز کا نشانہ لے رہا ہوں اس کے منہ میں پائپ تھا جسے اس نے باہر نکال لیا۔ اور آہستہ آہستہ دھواں نکالنے لگا وہ تمام وقت میری طرف دیکھتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔ میں نے سر ہلایا اور اس نے بھی سر ہلایا۔ اور اس نے

سیٹ پر میرے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔''(34)

(P-79)

ڈکنز کو مزاحیہ کردار تخلیق کرنے اور مزاحیہ صورتحال پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے۔ اس کے برعکس شوکت صدیقی کے ناولوں میں مزاح کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کے تمام ناولوں میں غم اور دکھ حاوی نظر آتا ہے۔ ناول ''خدا کی بستی'' میں چند مقامات ایسے ہیں جہاں مصنف نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے مزاح پر یاسیت غالب ہے۔ مثلاً نیاز کباڑیئے کے حلیے کی عکاسی مزاحیہ انداز میں کی گئی ہے۔

''اس روز وہ اپنا سیکنڈ ہینڈ امریکن کوٹ پہنے ہوئے تھا جس کی شکنیں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ اسے چند ہی روز پہلے خریدا گیا ہے۔ سر پر نئی جناح کیپ تھی۔ گردن میں گلوبند تھا۔ کباڑیوں کی اصطلاح میں وہ اس وقت ٹناٹن نظر آ رہا تھا''(35)

(ص:37)

''اس روز وہ بالکل چھیلا بن کر آیا تھا۔ سفید ململ کا کرتا اس کے نیچے شربتی بنیائن۔ کھڑکھڑاتی ہوئی لٹھے دار شلوار، ٹوپی بھی اس نے اتار دی تھی۔ آڑی مانگ نکال کر بڑی محنت سے بالوں کو جمایا تھا جن پر چپڑا ہوا خوشبودار تیل چمک رہا تھا۔ ایک ہاتھ کی کلائی میں موتیوں کے پھولوں کا گجرا تھا۔ کان میں عطر کا پھویا تھا۔ نیاز آ کر بیٹھا تو سارا گھر مہکنے لگا۔''(36)

(ص:54)

''وہ گھر سے نواب بن کر نکلتا۔ دوست احباب مذاق سے چھیڑتے ......ابے نیاز تو چھیلا بن گیا ہے۔ سالے پر جوانی چڑھ رہی ہے......ابے نیاز کباڑیے! اس عورت نے تو تیرے چار چاند لگا دیئے۔ بیٹا ایسے عیش تو تم نے باپ کے زمانے میں بھی نہیں کیئے۔''(37)

(ص:174، 175)

یہ مزاحیہ صورتحال پیدا کرنے کا مقصد قاری کو اطمینان اور سکون مہیا کرنا ہے۔ لیکن ناول نگار قاری کے دل میں طمانیت کا جو احساس اجاگر کرنا چاہتا ہے نہیں کر پاتا کیونکہ اس کی یاس بھری سوچ اس کے مزاحیہ پہلوؤں پر غالب آگئی ہے۔

چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈکنز کا اسلوب مزاحیہ ہے اور یہ مزاح بھی اس وجہ سے دیرپا رہتا ہے۔ کیونکہ ڈکنز کا اندازِ فکر رجائی ہے جبکہ شوکت صدیقی اپنے تلخ انداز بیاں کی وجہ سے ڈکنز سے جدا نظر آتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کے پلاٹ مربوط نہیں ہیں۔ دونوں مصنف رسائل میں قسط وار ناول لکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے ناولوں میں ربط نہ رہا۔ اشاعت کے لیے ہر قسط میں لفظوں کی مقررہ تعداد کے اندر لکھنے کی مجبوری اور ہر قسط کو نقطۂ عروج تک پہنچانا ضروری تھا تاکہ قاری کی دلچسپی قائم رہے یہی وجہ ہے کہ ناول کو جامع صورت نہ مل سکی۔

ڈکنز کے نالوں کے پلاٹ بے ربط اور غیر منظم ہوتے ہیں۔ ناولوں میں بہت سے ایسے بیانات اور تفاصیل موجود ہیں جو کہانی کے ارتقاء میں معاون ثابت نہیں ہوتے۔ A Tale of Two Cities، Our Mutual Friend, Great Expectations کے پلاٹ مربوط ہیں جبکہ باقی تمام ناول غیر مربوط ہیں۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ ڈکنز مشقت بھری توانائیوں کے ساتھ لکھتا چلا جاتا ہے وہ اپنے تخلیقی اضطراب کے آگے کوئی حکم صادر نہیں کرسکتا۔ اگرچہ ڈکنز ایک بہتر پلاٹ کا تانا بانا نہیں بن سکتا، وہ اپنی کہانیوں کے بیان کی وجہ سے قابل تعریف ہے۔ کہانی کے پہلے جملے سے ہی وہ قاری کی توجہ کو گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے کہانی کے اختتام تک بھٹکنے نہیں دیتا۔

ڈکنز کی کہانیوں کے پلاٹ اگرچہ غیر مربوط ہوتے ہیں لیکن اس کی کہانیوں کے مناظر ہمیشہ قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔ Little Nell کو تھیٹر کی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وفات پر جو تاثرات ابھرتے ہیں وہ گھٹیا جذباتیت کے حامل ہیں۔ لیکن اس منظر کی تصویر کشی بڑی ڈرامائی ہے۔ برف سے اَٹا ہوا چرچ اور پُرسکون اندھیرا جھونپڑا ہمیں اتنا واضح نظر آتا ہے جیسے ہم وہاں موجود ہوں۔

ڈکنز اپنے اسلوب پر قارئین کی رائے کو فوقیت دیتا تھا۔ شیکسپیئر کی طرح ڈکنز بھی اپنے ناولوں پر مثبت ردِعمل کا منتظر رہتا تھا۔ وہ قارئین کی طرف سے اپنے ناولوں کے بارے میں فوری ردِعمل چاہتا تھا۔ وہ

قارئین کی دلچسپی کا اندازہ رسائل کی فروخت شدہ کاپیوں کی تعداد سے لگا لیا کرتا تھا۔ جب رسائل کم فروخت ہوتے تو ڈکنز کی طرف سے فوری ردِعمل ہوتا۔ مثال کے طور پر ناول "Martin Chuzzlewit" میں جب قارئین کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ تو ڈکنز نے ناول کے ہیرو Martin کو امریکہ بھیج دیا۔ ناول "David Copperfield" میں قاری یہ پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ Mr.Micawber اچانک کیسے مجسٹریٹ بن جاتا ہے۔ نتیجتاً ڈکنز کے پلاٹ میں ربط نہ رہا۔ لہٰذا ہمیں اس کے اسلوب پر لوگوں کی رائے اثر انداز ہوتی نظر آتی ہے۔

سنسنی خیزی پیدا کرنے کے لیے ڈکنز کی کمرشل دلچسپی اس خط سے ظاہر ہے جو اس نے Wilkie Collins کو ایک مشترکہ لکھی جانے والی کہانی کے بارے میں لکھا۔

> ''ہمیں اپنی کہانی میں سردیوں کے موسم میں Alps پہاڑ پر لڑائی اور تعاقب دکھانا چاہیے۔ یہ لڑائی سنسان علاقے میں کشمکش سے بچ نکلنے یا مخالف تک رسائی کے لیے ہو جس پر کہانی کے عروج کا انحصار ہے۔ اس میں بھوت پریت سے دلچسپی، تصوراتی انہماک، وقت اور حالات کے بارے میں سائنس رو کے بغیر دلچسپی دکھائی جائے۔ اس طرح کہانی کو زبردست عروج تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اگر ہم کہانی اس انداز میں لکھتے چلے جائیں تو اسے زبردست قوت ملے گی اور یہ قارئین کے ذہنوں پر بجلی کی طرح گرے گی۔'' (38)

ڈکنز کمرشل دلچسپی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی پہلو کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لیے عامیانہ زبان استعمال نہیں کرتا بلکہ معیاری زبان کو ہی اولیت دیتا ہے اور زبان کے استعمال میں نفاست کے پہلو کو مدِ نظر رکھتا ہے۔

شوکت صدیقی کے ناولوں کے پلاٹ بھی جامع اور مربوط نہیں ہیں لیکن ناول ''خدا کی بستی'' کے پلاٹ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مربوط پلاٹ ہے۔ اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

> ''خدا کی بستی کے پلاٹ میں پیچیدگی، تنوع اور وسعت ہے۔

نیاز، خان بہادر، علی احمد اور سلمان سے متعلق واقعات براہِ راست راجہ اور نوشا کے قصے سے تعلق نہیں رکھتے مگر وہ اس سے بے تعلق بھی نہیں۔ پلاٹ کی تشکیل میں شوکت صدیقی نے نہایت دانش مندانہ فنی شعور کا مظاہرہ کیا ہے، اسلوب میں جرات اور بے باکی ہے جس کی وجہ سے کہیں کہیں اُکھڑا پن پیدا ہو گیا ہے مگر ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا...... خدا کی بستی کا پلاٹ زندگی کے وسیع تجربات کا احاطہ کرتا ہے معاشرے کی نیچی سطح تک جتنی برائیاں اور کمزوریاں موجود ہیں شوکت صدیقی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ انہیں پیش کیا ہے۔ برائیوں میں شاہ جی اور استاد بیڈرو ملوث ہیں۔ تو خان بہادر جیسے لوگ بھی ان سے محفوظ نہیں۔ ناول کے پہلے باب میں کم وبیش تمام کرداروں کو ناول نگار نے پیش کر دیا ہے۔ بات سے بات چلتی چلی جاتی ہے اور کردار واقعات کے ایک فطری بہاؤ کے ساتھ سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے باب میں واقعات کا دائرہ پھیلتا نظر آتا ہے۔ یہ واقعہ چوتھے باب تک ہے۔ پانچویں باب میں واقعات ایک دوسرا رخ اختیار کرتے ہیں۔ سکائی لارکوں کی تحریک اسی باب سے شروع ہوتی ہے اور ناول کے اخیر تک برقرار رہتی ہے۔ معاشرتی حقائق کی سنگینیوں اور تلخیوں کے مقابلے کے لیے یہی تحریک ایک قوت بن کر ابھرتی ہے جسے خان بہادر جیسے اہل زر اور اہل اقتدار لوگ پوری شدت سے کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخری دو ابواب سے واقعات سمٹنے لگتے ہیں اور پلاٹ اپنے انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ اختتام پر شوکت صدیقی نے ناول کے تمام واقعات کو فنکارانہ اظہار اور تخلیقی ذہانت کے ساتھ سمیٹا ہے۔ مجموعی طور پر ناول کے پلاٹ میں کوئی خامی نہیں مکالمے چھوٹے اور چست ہیں ان میں اعتدال، میانہ روی

اور توازن ہے۔ جلسوں کے مواقع پر جو تقریریں ملتی ہیں، وہ نہایت موزوں اور مناسب ہیں ان تقریروں کا اندازِ تحریر بہت ہی محتاط ہے۔ جملوں میں بے ساختگی اور اسلوب میں روانی شروع سے اخیر تک ملتی ہے۔"(39)

شوکت صدیقی کے ناول ''جانگلوس'' اور ''چار دیواری'' کے پلاٹ غیر مربوط ہیں وجہ یہ تھی کہ یہ ناول رسائل میں قسط وار شائع ہوتے رہے اور بعد میں انہیں کتابی صورت دے دی گئی۔ ہر کہانی کے اختتام پر تجسس قائم رکھنا ضروری تھا تاکہ لوگ بیزاری محسوس نہ کریں اور ان کی طلب میں مزید اضافہ ہو۔ شوکت صدیقی کے ناول جانگلوس کی کہانی شہرزاد (۴۰) کی کہانی معلوم ہوتی ہے جو ہر رات کہانی کو ایک نئے موڑ پر لے آتی ہے۔ یہی نیا موڑ اس کی زندگی کی بقاء کی دلیل بن جاتا ہے۔ صدیقی بھی ناول کی بقاء کے لیے اپنے ہیرو کو نئی دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں۔ وہ عوام کی دلچسپی قائم رکھنے اور ان میں چٹخارہ پیدا کرنے کے لیے عامیانہ زبان کو ادبی زبان پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیقی کے ناول وہ مقام حاصل نہ کر سکے جو ڈکنز کے ناولوں کو حاصل ہوا۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے اسلوب کا تفصیلی جائزہ دونوں ادیبوں میں موجود مماثلت اور امتیازات کو نمایاں کرتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ Stephen Wall (ed), "Charles Dickens", P.67, Penguin Books, 1970

"When he has introduced a girl - her cheeks blotched with rouge, her frock bright red , her boots green, her hair stuck over with yellow hair - papers .... the very next time be alludes to her, he calls her 'this young lady'! Now, if he had called this girl by her actual designation ...... the book would have been destroyed; whereas, the reader perfectly well knows what class the poor gaudy outcast belongs to, and the author gains a humorous effect by the evasive appellation. In like manner he deals with a dirty young thief, as 'the first - named young gentleman'; while the old Jew Fagin _ a horrible compound of all sorts of villainy, who teaches the young idea' the handicraft of picking pockets, under pretence of having an amusing game of play with the boys _ the author designates as 'the merry old gentleman'! ..... In this way the author avoids disgust."

2۔ Harvey Peter Sucksmith "The Narrative Art of Charles Dickens," P.24, Oxford the Charendon Press, 1970.

"If my readers have derived but half the pleasure and interest from its perusal, which its composition has afforded me, I have ample reason to be gratified.

3۔ اے۔بی۔اشرف، ڈاکٹر، ''خدا کی بستی.....ایک عوامی ناول'' مشمولہ ''ادب اور سماجی عمل'' ملتان، کاروان ادب،1980ء۔

4۔شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:372، کراچی رکتاب پبلی کیشنز، 1995ء۔

5۔ایضاً ،ص:374۔

6۔ Charles Dickens,"Oliver Twist",P.139,Thomas Neslon and Sons Ltd.

7۔ Ibid, P.141

8۔ Ibid, P.141

9۔ Charles Dickens, "David Copperfield" P.495,
Thomas Nelson And Sons.

10۔ Ibid, P.353

11۔ Charles Dickens, "Great Expectations", P.150,
Oxford University Press London, 1957.

12۔شوکت صدیقی، ''جانگلوس'' (جلد اول) کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1998ء۔

13۔ایضاً ،ص:103۔

14۔شوکت صدیقی، ''خدا کی بستی'' ص:306

15۔ایضاً ،ص:308، 309۔

16۔ایضاً ،ص:370۔

17۔اسلم آزاد، ''اردو ناول آزادی کے بعد'' ص:253، نئی دہلی، نریندر ناتھ سوز، 1990ء۔

18۔شوکت صدیقی ''خدا کی بستی'' ص:93، 94۔

19۔ Charles Dickens "David Copperfield" P.223.

"Mr.Dick:, said my aunt, "What shall I do with this child?"

Mr. Dick considered, hesitated, brightened, and rejoined, "Have him measured for a suit of clothes directly."

Ibid, P.235 -20

"Never," said my aunt,"be mean in anything; never be false; never be cruel. Avoid those three vices, Trot, and I can always be hopeful of you."

Ibid, P.33 -21

"To hear the wind getting up out at sea, to know that the fog was creeping over the desolae flat outside, and to look at the fire and think that there was no house near but this one, and this one a boat, was like enchantment

Ibid, P.30 -22

"When we got into the street (which was strange enough to me), and smelt the fish, and pitch, and oakum, and tar, and saw the sailors walking about, and the carts jingling up and down over the stones, I felt that I had done so busy a place an injustice; and said as much to Peggotty, who heard my expressions of delight with great complacency."

Ibid, P.261 -23

"But it pained me to think of the dear old place as altogether abandoned _ of the weeds growing tall in the garden, and the fallen leaves lying thick and wet upon the paths. I imagined how the winds of winter would howl round it, how the cold rain would beat upon the window-glass, how the moon would make ghosts on the walls of the empty rooms, watching their solitude all night! I thought afresh of the

grave in the churchyard, underneath the tree; and it seemed as if the house were dead too, now, and all connected with my father and mother were faded away."

Charles Dickens, "Bleak House",P.1, Penguin Popular Classics, 1995 -24

"Fog everywhere. Fog up the river, where it flows among green aits and meadows; fog down the river, where it rolls defiled among the tiers of shipping, and the waterside pollutions of a great (and dirty) city. Fog on the Essex marshes, fog on the Kentish heights _ fog in the stem and bowl of the afternoon pipe of the wrathful skipper down in his close cabin; fog cruelly pinching the toes and fingers of his shivering little' prentice boy on deck. Chance people on the bridges peeping over the parapets into a nether sky of fog, with fog all round them, as if they were upon in a balloon, and hanging in the misty clouds."

Charles Dickens,"Dombey and Son",P.238, A Signet Classic, 1964. -25

"When the sunbeams struck into his room through the rustling blinds, and quivered on the opposite wall like golden water, he knew that evening was comming on, and that the sky was red and beautiful. As the reflection died away, and a gloom went creeping up the wall, he watched it deepen, deepen, deepen, into night. Then he thought how the long streets were dotted with lamps, and how the peaceful stars were shining overhead. His fancy had a strange tendency to wander to the river, which he knew was flowing through the great city; and now he thought how

black it was, and how deep it would look, reflecting the hosts of stars-and more than all, how steadily it rolled away to meet the sea."

26۔اسلم آزاد''اردو ناول آزادی کے بعد''ص:241۔

27۔شوکت صدیقی''خدا کی بستی''ص:122۔

28۔ایضاً،ص:156۔

29۔ایضاً،ص:338،339،340۔

03۔حنیف فوق،ڈاکٹر''خدا کی بستی اور اردو ناول نگاری''س:62،مشمولہ ماہنامہ''دائرے''کراچی،1989ء۔

31۔شوکت صدیقی،''جانگلوس''(جلد اول)ص:128۔

Charles Dickens, "David Copperfield," P.1 -32

Ibid, P.4 -33

"When she reached the house, she gave another proof of her identity. My father had often hinted that she seldom conducted herself like any ordinary christian; and now, instead of ringing the bell, she came and looked in at that identical window, pressing the end of her nose against the glass to that extent that my poor dear mother used to say it became perfectly flat and white in a moment."

Charles Dickens,"Great Expectations", P.79 -34

"He was a secret looking man whom I had never seen before. His head was all on one side, and one of his eyes was half shut up, as if he were taking aim at something with an invisible gun. He had a pipe in his mouth, and he took it out, and, after slowly blowing all the time, nodded.

So I nodded, and then he nodded again, and made room on the settle beside him that I might sit down there."

35۔شوکت صدیقی ''خدا کی بستی'' ص:37۔

36۔ایضاً ص:54۔

37۔ایضاً ص:174، 175۔

38۔ Philip Collins, "Dickens and Crime," P.2

"Let us arrange to culminate in a wintry flight and pursuit across the Alps, ... Let us get into all the horrors and dangers of such an adventure under the most terrific circumstances, either escaping from or trying to over take .... and Nemesis of the story depend. There we can get Ghostly interest, picturesque interest, breathless interest of time and circumstance, and force the design up to any powerful climax we please. If you will keep this in your mind as I will in mine, urging the story towards it as we go along, we shall get a very Avalanche of Power out of it, and thunder it down on the readers heads".

39۔اسلم آزاد، ''اردو ناول آزادی کے بعد'' ص:252، 253، 254، 255۔

40۔''شہرزاد'' مشہور زمانہ کتاب "Arabian Nights" کا ایک کردار ہے۔

باب ششم

ماحصل

باب ششم

ماحصل

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی دونوں معاشرتی ناول نگار ہیں دونوں کے ناولوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان مسائل پر تنقید کی گئی ہے۔ دونوں اخلاقیات کے حق میں جذباتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ انصاف، دیانت داری اور رحم کے متقاضی ہیں۔ دونوں مصنفین اپنے عہد کی خرابیوں پر طنز کرتے ہیں ان کے ناولوں میں غلط انسانی رویوں اور معاشرتی اداروں کے نقائص کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ڈکنز نے Bleak House، Hard Times اور Little Dorrit میں معاشرتی اداروں کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ شوکت صدیقی نے کمین گاہ، خدا کی بستی اور جانگلوس میں بااختیار طبقے پر طنز کیا ہے جو انسانی خوشیوں میں رکاوٹ بنتا ہے۔ دونوں مصنفین قوانین کے نظام، ذات کے تصنع، معاشرتی برائیوں، معاشی ناانصافیوں، مذہبی، تعلیمی اور سیاسی حماقتوں، سرمایہ دارانہ نظام اور نااہل حکومت پر طنز کرتے ہیں۔ Mr.Dombey، Mr.Bumble اور Mr.Pecksniff ڈکنز کے طنز کا شکار ہیں۔ سیٹھ تولو کی چند، خان بہادر، احسان شاہ، شہ زور مزاری، مراد خان شاہانی، شوکت صدیقی کے طنز کا نشانہ ہیں۔

دونوں مصنفین اس بات کے قائل ہیں کہ ہمدردی اور بہبود کے بغیر سرمایہ کاری سے سرمایہ دار اور محنت کش کے باہمی روابط میں مسلسل مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ وہ حد سے بڑھتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف ہیں۔ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ بہت سے کارکن ایسے ہیں جنہیں مزدوری نہیں ملتی اگر ان کے دکھوں کا ازالہ نہ کیا گیا تو معاشرتی زندگی میں بحران پیدا ہو جائے گا۔ انہیں اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اگر غریب طبقہ مسلسل مصائب کا شکار رہا تو یہ طبقہ ظلم و بربریت کے خلاف زبردست انقلاب کا پیشِ خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی بنی نوع انسان سے عدل و انصاف اور آزادی کا تقاضا کرتے ہیں دونوں نااہل حکمران طبقے کو حکومت سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ ہر انسان کے لیے انصاف کے سازگار حالات چاہتے ہیں۔ فرسودہ اداروں کو گرانے کے حق میں ہیں۔ وہ معاشی استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں۔

چارلس ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں کو معاشرتی مناظر کہا جاتا ہے۔ تاہم دونوں مصنفین نہ تو معاشرتی تاریخ دان ہیں اور نہ ہی مہم جو سیاستدان۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انہیں معلوم ہوا کہ سیاستدانوں کی اکثریت فضولیات میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ قانون کو اس وقت برا کہتے ہیں جب با اثر طبقہ اور ان کا اقتدار ذمہ داری سے عاری ہو۔ کوئی ادارہ جو اپنی ذمہ داریوں سے انکار کرتا ہے ڈکنز اور صدیقی اسے رد کرتے ہیں۔ دولت کو عمومی طور پر وہ رد کرتے ہیں۔ دولت بذاتِ خود گناہ نہیں لیکن جس انداز میں یہ ناانصافیوں کو جنم دیتی ہے۔ اور لوگ اس کی دیوتا کے طور پر پوجا کرتے ہیں، لوگوں کے اس رویہ کو وہ ناپسند کرتے ہیں یہی صورتحال ڈکنز کے ناول "Our Mutual Friend" اور شوکت صدیقی کے ناولٹ ''کمین گاہ'' خدا کی بستی'' اور'' جانگلوس'' میں دکھائی گئی ہے۔ دونوں نے جھوٹی خیر خواہی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ڈکنز کی تحریر میں ایک رپورٹر کی صفت پائی جاتی ہے وہ اپنے مشاہدے سے حاصل کی ہوئی معلومات کی ہو بہو عکاسی کرتا ہے۔ Oliver Twist کا بدقماش لوگوں کے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ ماں کی موت کے بعد David Copperfield کی حالت زار اس پر سوتیلے باپ کی سختیاں، "A Tale of Two Cities" میں غریبوں پر روٴسا کے مظالم ڈکنز کے عمیق مشاہدے کا مظہر ہیں جو ایک واقعاتی رپورٹ کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔

شوکت صدیقی کی تحریریں بھی ان کے مشاہدے پر مبنی ہیں۔ چنانچہ ''خدا کی بستی'' میں راجہ، شامی، انو اور نوشا کا آوارہ ہو جانا، رضیہ اور اس کی بیٹی سلطانہ کی بے بسی، سکائی لارک تنظیم مصنف کے مشاہدے کی پیداوار ہیں۔

''خدا کی بستی''، ''جانگلوس'' اور ''کمین گاہ'' میں حقیقت نگاری کی گئی ہے۔ ڈکنز کے ناولوں "David Copperfield"، "Great Expectations"، "Oliver Twist"، "A Tale of Two Cities"، "Hard Times" میں بھی اسی تلخ حقیقت کا اظہار ملتا ہے۔

ڈکنز نے Pip، David Copperfield، Oliver Twist، Paul Dombey، Little Nell، کی صورت میں بچپن کے دکھ بھرے مناظر دکھائے ہیں۔ شوکت صدیقی نے نوشا، راجہ، شامی اور انو کی دکھ بھری اور تلخ زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

جہاں ڈکنز اور شوکت صدیقی کے ناولوں میں بہت سے پہلو مماثلت رکھتے ہیں وہاں متضاد پہلو بھی

سامنے آئے ہیں۔شوکت صدیقی کے ناول ''جانگلوس'' کا ہیرو خطرناک حالات میں سے اکثر بچ نکلتا ہے اور یہ بات اکثر اوقات قرینِ قیاس نہیں لگتی جب کہ ڈکنز کے ناولوں کا ہیرو امکان کی حدود میں خطرات کو عبور کرتے ہوئے زندہ رہتا ہے۔شوکت صدیقی کے ناولوں میں شاعرانہ انصاف نہیں ہے۔مظلوم انسان پے در پے تکالیف، اُٹھاتے رہتے ہیں جبکہ ظالم طبقہ استاد پیڈرو، خان بہادر، ترلوکی چند، احسان شاہ، شہ زور مزاری، مراد خان شاہانی، جیسے افراد اسی آب و تاب کے ساتھ دنیا پر حکومت کرتے نظر آتے ہیں ڈکنز اپنے ناولوں کا خاتمہ اطمینان بخش کرتا ہے اس کے ناولوں میں شاعرانہ انصاف (Poetic Justice) ہے۔ ہر فرد کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا ملتی ہے۔Fagin کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔

Bill Sikes اپنے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔Monks بھی اپنے طرزِ زندگی کو نہیں بدلتا لہٰذا اذیت کی موت پاتا ہے۔Micawber ایک اچھا انسان ہے وہ آسٹریلیا میں مجسٹریٹ بن جاتا ہے جبکہ Uriah Heep برا آدمی ہے اسے قیدِ تنہائی کاٹنا پڑتی ہے۔شوکت صدیقی کے ناولوں کا اختتام طمانیت سے عاری ہے جبکہ ڈکنز کے آخری مناظر میں قاری کو سکون (Relief) ملتا ہے۔

شوکت صدیقی عامیانہ حیثیت کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو نفاست سے عاری ہوتے ہیں جبکہ ڈکنز نفیس الفاظ کے استعمال کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے۔شوکت صدیقی کے ہاں مزاح کا عنصر نہیں ملتا جبکہ ڈکنز کی تحریر مزاح سے چمک اُٹھتی ہے۔

شوکت صدیقی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے بہتر ہو جانے کی امید تو رکھتا ہے لیکن اس کے ہاں رجائیت کا احساس نہیں ملتا بلکہ یاسیت کا عنصر حاوی نظر آتا ہے۔صدیقی کے برعکس، ڈکنز کے ناولوں میں امید کا پہلو نظر آتا ہے۔دکھوں اور اندھیروں میں سے راستہ نکل کر روشنیوں کی طرف جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے اکثر ناولوں کا اختتام طربیہ ہے۔یہ امید ہی تو ہے جس کے سہارے زندہ رہنے کی خواہش میں انسان نہیں مرتا۔دنیا میں تہہ در تہہ تاریکیوں کے باوجود، ڈکنز زندگی کے روشن پہلو کو مدِ نظر رکھتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈکنز اور صدیقی کی ناول نگاری میں انتہا کی حد تک مماثلت ہے اگر چہ یہ مماثلت بعض اوقات نہیں ملتی لیکن کوئی بھی ناولسٹ کلی طور پر ایک دوسرے کا عکاس نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے دور اور اپنے تجربات کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

کتابیات

(الف) شوکت صدیقی کے ناول:

1۔ ''کمین گاہ''(سالِ تصنیف 1945، صفحات 176)، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1997۔

2۔ ''خدا کی بستی''(سالِ تصنیف 1957، صفحات 480)، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1995۔

3۔ ''جانگلوس'' جلد اول (سالِ تصنیف 1978، صفحات 600)، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1998۔

(i) ''جانگلوس'' جلد دوم (سالِ تصنیف ، صفحات، 656)، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1998۔

(ii) ''جانگلوس'' جلد سوم (سالِ تصنیف 1989، صفحات 744)، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1999۔

4۔ ''چار دیواری''(سالِ تصنیف 1988، صفحات 768)، کراچی، رکتاب پبلی کیشنز، 1990۔

(ب) چارلس ڈکنز کے ناول:

5- "The Pickwick Papers" (Written in, 1836-37,Pages 886), Penguin Books, 1994.

6- Oliver Twist" (Written In, 1837-38, Pages 506), Thomas Nelson Ltd.

7- "Nicholas Nickleby" (Written in, 1838-1839, Pages 787), Books London and Sudney, 1968.

8- "Old Curiosty Shop "(Written in ,1840-41-Pages ,510)Collins London And Glasgow,1972.

9- "Barnaby Rudge"(Written in 1841)

10- "Martin Chuzzlewit" (Written in, 1843-44, Pages,713), Penguin Books, 1994.

11- "Dombey and Son" (Written in,1846-48, Pages,916), A Signet Classic, 1964.

12۔ "David Copperfield" (Written in,1849-50, Pages,920), Thomas Nelson and Sons Ltd.

13۔ "Bleak House" (Written in,1853, Pages,808), Penguin Books 1995.

14۔ "Hard Times" (Written in,1854, Pages,268), Penguin Books, 1994.

15۔ "Little Dorrit" (Written in, 1855-57, Pages,932), The Madarin Paperback, 1991.

16۔ "A Tale of Two Cities (Written in,1859, Pages,367), Penguin Books 1994.

17۔ "Great Expectations" (Written in,1860-1861, Pages,520), Oxford University Press, 1957.

18۔ "Our Mutual Friend" (Written in,1864-65, Pages,911), Penguin Books, 1971.

19۔ "The Mystery of Edwin Drood" (Written in,1870, Pages,239), Oxford University Press, 1982.

(ج) تحقیقی وتنقیدی کتب (اردو):

20۔ اسلم آزاد، ''اردو ناول آزادی کے بعد'' صفحات:405، نئی دہلی، نریندر ناتھ سوز، 1990ء۔

21۔ اے۔بی۔اشرف، ڈاکٹر، ''ادب اور سماجی عمل'' صفحات:152، ملتان، کاروانِ ادب، 1980ء۔

22۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں'' صفحات:702، کراچی، انجمن ترقی اردو، 1991ء۔

23۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ''ناول کیا ہے؟'' صفحات:172، لکھنو، نسیم بک ڈپو، 1964۔

24۔ خالد اقبال یاسر (مرتب)، ''ادبی جائزے کل پاکستان اہل قلم کے مقالات'' صفحات:301، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1986۔